

در پیر

شک

قیمت ۸۰

تصانیف حضرت نیاز مخپوری

نگارستان حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان کے نگار میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مضامین غیر زبانوں میں نقل کے اہمیت علاوہ محصول	گہوارہ تمدن مولانا نیاز کی وہ معرکہ الآما کتاب جس میں تلخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا گہرا دست حصہ لیا اور کتنے ہونے والے کس قدر مضامین پر اردو میں بالکل نیا ہے قیمت علاوہ محصول	شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر افسانہ جو اردو زبان میں پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی ہندی مضمون اور اس کی اشارہ عابدی حلال کے درجہ تک پہنچے ہے قیمت علاوہ محصول	فراست الیہ مولانا نیاز مخپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی سے ان کی شناخت و اس کی لکیروں کے پتے پڑنے لگتے ہیں۔ یہ افسانہ سیرت عروج و زوال مرثیہ جٹا لکھنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ اس کے متعلق صحیح چینی کوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول	شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنوان شہاب کا مطالعہ سے ایک شخص آسانی سے ان کی شناخت و اس کی لکیروں کے پتے پڑنے لگتے ہیں۔ یہ افسانہ سیرت عروج و زوال مرثیہ جٹا لکھنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ اس کے متعلق صحیح چینی کوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول	جذبات بھاشا جناب نیاز نے ایک دلچسپ و مفید کتاب لکھی ہے جس کے عنوان شہاب کا مطالعہ سے ایک شخص آسانی سے ان کی شناخت و اس کی لکیروں کے پتے پڑنے لگتے ہیں۔ یہ افسانہ سیرت عروج و زوال مرثیہ جٹا لکھنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ اس کے متعلق صحیح چینی کوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول
صحابیات جس میں عہد سعادت کی وہ خوبیاں کے مستند حالات بیان کر دیے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں سب سے زیادہ صحابہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں طبعی کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول	نقاب ٹھکانے کے بعد تین افسانوں کا مجموعہ جس میں نیاز نے اپنے کچھ نئے اور پرکشش افسانے لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲/ علاوہ محصول	مذاکرات نیاز یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عابد کا عجیب غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲/ علاوہ محصول	فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں۔ چند نئے فلسفہ قدیم کی رد و حق کے ساتھ ساتھ ادھن کا مذہب و حرکت کے کوشش نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت ۸/ علاوہ محصول	تاریخ الدولین جرجی زیدان کے تاریخ قدیم الاسلام کی جو جلد کا ترجمہ جس میں عہد نبی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل مضمون لکھا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت ۸/ علاوہ محصول	المسئلۃ الشرعیہ مصطفیٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ۔ یہ کتاب ہے جس نے یورپ میں دنیا کے سیاسیات میں پہلی ڈال دی تھی، اور جرجی زیدان سے پہلے نہ کی و معزز عرب و حجاز میں انقلاب کی روش چھوٹی قیمت ۸/ علاوہ محصول
تذکرہ خندہ گل مولانا عبدالباری آسی جس میں ۳۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی ظریف شاعروں کے حالات و انکشاف و نظریات انتخاب کلام کے ہیں قیمت ۳۰/ محصول	غنوی لالہ رخ طامس سور کی معرکہ الآرا غنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ ہے قیمت ۳۰/ محصول	غنوی زہر عشق مرتبہ مجنوں گورکھپوری جس میں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویروں کی ہیں بک تصویر نگاری۔ قیمت ۸/ علاوہ محصول	فراست التحریر مکمل یعنی اردو و انگریزی رسم الخط اور انداز تحریر و دیگر کراہی شخص کی سیرت چال چلن متقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں پہلی کتاب ہے قیمت ۸/ علاوہ محصول		

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
 رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
 سالانہ قیمت پانچ روپیہ (دس ستمبر تا تین دسمبر) ہے۔
 بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

جلد ۲۵	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۴ء	شمارم
۲	ملاحظات	
۹	ملکہ نور جہان تاریخ کی صحیح روشنی میں	
۲۱	شاہ محمد ظہیر زبیری	
۲۱	مکتوبات نیاز	
۲۴	انگلستان کے دستور پر ایک تاریخی نظر	
۲۴	ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بار ایٹ لا	
۳۶	بھیا کی جڑیاں	
۳۶	عبدالجلیل	
۴۰	یاد رفتگان	
۴۵	غالب کا ایک شعر	
۴۵	محمد اسحاق	
۵۲	سادھو کی بظ	
۵۲	احسن	
۵۴	باب المراسلۃ والمناظرہ	
۵۴	مطبوعات موصولہ	
۵۸	پردیسی کی فریاد (نظم)	
۵۸	علی اختر	
۸۰	اعتبار (نظم)	
۸۰	روشن صدیقی	

نگار

ادبیر۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	اپریل ۱۳۳۶ء	شمار ۴
--------	-------------	--------

ملاحظات

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے میں وہ موانع حائل کرتا رہے۔ آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھا جائے۔ اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علیحدہ علیحدہ پوچھئے کہ جب مذہب 'خدا کی حقیقت ٹھیرا، تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی جبکہ حقیقت کبھی بدل نہیں سکتی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کر کے انسان کو کیوں الجھن میں ڈال دیا۔۔۔ اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دے گا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ سے ظاہر کی جا چکی ہے ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے، ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی، اسی طرح بودھ مت والا بودھ کی تعلیمات کو، ایک ہندو کرشن کی ہدایات کو اور ایک مسلمان محمد

کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کر کے لغو و باطل قرار دے گا

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے، یہ سنکر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لے کر سب کو لغو نہ کہدے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ خود کوئی فیصلہ کر کے کسی ایسے نتیجہ پر پہنچے جو اس کے لئے قابل قبول ہو

اچھا آئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہو کر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کتنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا براہِ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الہانہ زبان میں اس کی تلقین فرمائے، یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کر کے اصولِ مذہب وضع کرنے کی طرف مائل کرے، بہر حال جو صورت بھی ہو، اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ مذہب نام ہے ان اصول کا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتداد زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصولِ مذہب کا تغیر بھی لازم ہے

انھیں اصولِ زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشری قانون کی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نفع و لذت حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے آگے بڑھ کر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، اس کے لئے بہ لحاظِ نتیجہ یہ دینی عقائد بالکل بیکار ہیں، کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رہبر، رشی، دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں، پورا ہی نہیں ہوا اور وہ عقائد محض عقائد ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کر کے بعض مخصوص عقائد پیدا کئے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تنخیف سے حقیقی مدعا کی طرف لاسکیں

اس جگہ یہ سوال اٹھانا کہ اگر عقاید دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیاء نے ان کو حقیقت ظاہر کر کے غلط بیانی سے کام لیا، درست نہیں کیونکہ اول تو اس امر کا امکان ہے کہ ان میں سے اکثر نے اُن عقائد کو واقعی حقیقت باور کر کے پیش کیا ہو اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا ظاہر کرنا قرین مصلحت جانا ہوگا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کھدینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی مورد الزام نہیں ہو سکتا

وہ عقائد دینی جو آج معرض بحث میں ہیں زیادہ تر مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں یا خدا کے مفہوم سے۔ یعنی اہل مذاہب ایک تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسرے یہ کہ خدا نام ہے ایک ایسی ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صنّاع اپنے قائم کے لئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو تیار کرتا ہے اور وہ خدا قادر ہے جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کر کے کائنات کے نظام کو بدل دے

آپ اگر جستجو کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ عقائد موم تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہر اس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہات عقائد دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریباً ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اول اول ان کو حقائق جان کر پیش کیا۔ ہر چند امر ثانی کے متعلق کوئی تعین دشوار ہے لیکن امر اول کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے اپنے مابعد مذہب کے معتقدات سے فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ عہد قدیم تک پہنچ کر اس زمانہ وحشت تک پہنچ جاتا ہے، جب انسان کے تجربات دنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و نامکمل تھا۔

مثلاً آپ جنت اور حور و غلمان کو لے لیجئے۔ کیا کوئی مسلمان دعوے کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا۔ اگر آپ قدیم ایرانی اور آریں لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں ایک لفظ پرتی ہے جو قدیم ایرانی زبان میں ”پیرک“ تھا۔ اور پروانِ زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے، چنانچہ خود عربی کا فردوسِ ایرانی لفظ ہے

لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے، دراصل ایک اس کا ماخذ اوستا کا لفظ ”ہورہ“ ہے جسے پہلوی زبان میں ہور اور موجودہ فارسی میں حور کہتے ہیں، جس کے معنی نور، روشنی اور مجازاً آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور ان کے لئے اپسرائیں اور ”گندھپ“ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں

کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آریں خیال ہے۔ چنانچہ دھرم شاستر

میں لکھا ہے کہ جب جنگ میں لوگ بہادری سے لڑتے ہیں۔ اور بیٹھ نہیں دکھاتے تو بہشت میں جاتے ہیں۔ اسی طرح اندر، راجہ تل سے جسوقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انھوں نے ”قالوا بلیٰ“ کہا تھا۔ پاریوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ ”فروشی“ پایا جاتا تھا۔ اور پہلوی زبان میں اس کو ”فرورہر“ کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں۔ جو اس کے یہاں پایا جاتا تھا

اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور ان کے یہاں بھی ایک فرشتہ ”استودیدھوتوس“ کے نام سے پایا جاتا تھا جو روح کو جسم سے جدا کرتا تھا

عزائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں، اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح میزان، صراط، نور محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت، وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسائل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے۔ اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوع انسانی میں پرورش پاتے چلے آ رہے ہیں۔ اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشوونما کی یادگار ہیں

ابتدائے عہد انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عاید ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشری نظام کو قائم رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ افراد قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دور کرے

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے، کوئی مر جاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا، کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض ان کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردار قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اسے اپنا منصب قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قایدانہ حیثیت ضعیف ہو جاتی اور قبائلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہو سکتا

پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان کی طرف سے لوگوں کو تکلیف پہونچا کرتی تھی۔ اس لئے بقاء روح کے خیال سے ان کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب و ثواب کے محل قرار دے کر ترغیب و تنویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں۔ جو اصلاح قبایل اور اصول معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جتنے مذاہب معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور

چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے، اس لئے حیات مابعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں بیان کیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں

خدا کا وہی قہر مانی تصور جو دنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اس کا وہی مختار کُل ہونا جو ایک مستبد حکمران انسان کی خصوصیت ہے، بہشت میں انھیں لذائذ و نعمات کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل دہلا دینے والے مناظر بیان کرنا۔ جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بنیاد پر تھے جو تجربات دنیا کے سلسلہ میں قائم کیا گیا اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا

مثلاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سر زمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی۔ دنیاوی لذائذ و نعمات میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ ان کا انتہائی نقطہ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالتا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ جس دلاعلی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی دے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہد گر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہتا وہاں کا معمولی منظر تھا، باوجود ایک ہی سر زمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جدا تھا اور افتراق کی وہ تمام کردہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جدا کر دیا کرتی ہیں ان میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا رفاہ مرکا اولین فرض ہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔ ہر چند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہل عرب واقف نہ ہوتے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لئے ان کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا

ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہو سکتا تھا اس لئے اصلاح معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عفتائد علیٰ حالہ قائم رکھے گئے۔ جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی۔ اگر جاہل عربوں کے سامنے انہماک حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے

لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعمات فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ تباہ ہو رہے ہیں اور عذاب دوزخ اسی قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے۔ جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ ان اصول اخلاق کے پابند ہو سکے جنکی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے

اس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے ان معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا

کیونکہ اُن سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج اُن معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جاسکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں۔ اور یہ ایک ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانی اسلام نے ظاہر کیا

جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہنے کا عادی ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے، جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قائم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا، آپ نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظور ہو سکتا ہے، آپ نے مذہب کے باب میں کبھی جبر و اشتداد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابل قبول تھا تو دوسری طرف اہل علم و عقل کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں، حقیقت سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں

پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈ ڈھالے اور بتائے کہ کیا محمدؐ کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر اگر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو۔ جس نے اپنے آپ کو ”انا بشر مثلكم“ سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو، جو معجزات اور خرق عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لئے تلوار اٹھانا حرام قرار دیا ہو۔ جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو، جو دایمہ پرستی و لالیعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی، اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے

اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمدؐ کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعوے صرف اسلام ہی کر سکتا ہے

یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اس کی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آسکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم، کیونکہ آج خود ہمارے علماء کرام اور واعظان ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا، جن کی پشت پر مہر نبوت ثبت کر کے خدا نے بھیجا تھا، جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے۔ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اتر کر آیا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے خواہ اُن سے زیادہ لائے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں۔ وہ ایک براق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش اعظم تک پہنچے اور ذات خداوندی سے ہمکلام ہوئے، جبریل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی۔ تاکہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے۔ اور آپ ایک

اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے۔ پھر یہ واہمہ پرستی یہیں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ صوفیہ کرام نے تو یہاں تک کم دیا کہ احمد اور احمد میں تو میتم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا الٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا

آپ کسی مجلس میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و خوارق عادات سننا ناگزیر ہو گا۔ اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دو چار واقعات اخلاق محمدی کے متعلق سننے میں آئیں گے

اس لئے موجودہ زمانہ میں جب کہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دنیا میں پیدا ہو رہی ہے۔ اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیونکر محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اس کے ساتھ کر رہے ہیں ان کو کیونکر دفع کیا جاسکتا ہے، اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ ترکی و ایران کی طرح حکومت اپنی ہو اور بزورِ شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے، یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسبہ میں تمیز کر سکیں۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے، جو دیر طلب تو یقیناً ہے، لیکن کسی نہ کسی دن بہر حال اُسے پورا ہو کر رہنا ہے

لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ۱۲ مارچ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں اور امر دہلی تشریف لیجائیں گے وہاں سے لاہور جانے کا قصد ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں تجدیدِ شباب کے پہلے ماہر ہیں اور جرمنی، ویانا وغیرہ میں کافی عرصہ تک قیام کر کے اس فن کے تمام شعبوں میں عملی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے متعدد رسائل بھی اس فن پر تصنیف فرمائے ہیں جن میں سے بعض پر نگار میں رپورٹ ہو چکا ہے ”جوانی کے تحفظ“ پر ایک کتاب زیادہ بسیط و ضخیم اور بھی آپ نے شائع کی ہے، جس کا مطالعہ ہر شخص کو کرنا چاہئے

”تجدیدِ شباب“ ایک ایسی خواہش ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں، لیکن عام طور پر اس کا مفہوم بہت عامیانہ لیا جاتا ہے۔ شباب نام صرف بھیمی قوت کا نہیں ہے بلکہ اس نشاط و دلورہ کا ہے جو جوانی میں ایک انسان کو سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر وسیع مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کے گزشتہ تجربات میں سے اکثر جرتناک نتائج پیدا کرنے والے ثابت ہوئے ہیں

جو حضرات اس باب میں جدید ترین معلومات حاصل کرنے کے متمنی ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ڈاکٹر صاحب موصوف سے گو لکندہ حیدر آباد کے پتہ پر خط و کتابت کریں اور ان کے رسائل کا مطالعہ کریں، جو نہایت صاف و شگفتہ زبان اور بہت دلچسپ پیرایہ میں بحسب معلومات جدیدہ سے لبریز ہیں

ملکہ نورجہاں تاریخ کی صبح روشنی میں

(سلسلہ ماضی)

درحقیقت شیرانگلن کے قتل کا واقعہ یوں ہے

یہ تو ہم کو معلوم ہے کہ شیرانگلن بنگال کا جاگیردار تھا شاہ اسماعیل صفوی کی وفات کے بعد علی قلی خاں قندھار کے راستے سے ہندوستان آتا ہے اور خاندان کے دربار میں سائی پیدا کرتا ہے رفتہ رفتہ دربار شاہی میں رسوخ ہوتی ہے۔ جاگیر ”شیرانگلن“ کا خطاب دیتا ہے اور بنگال میں جاگیر دے کر سر فراز کرتا ہے یہاں یہ نہایت اہمیت و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ۱۶۷۷ء میں بنگال میں افغانوں کی بغاوت زیر سرکردگی عثمان خاں شروع ہوتی ہے۔

یعنی پرشاد اپنی کتاب جاگیر میں لکھتے ہیں :-

اس وقت بنگال میں بغاوت سازش کا بازار نہایت گرم تھا، افغان سرکشی اور شرارت پر اتر آئے تھے (جائگیر) کو شہ ہوتا ہے کہ شیرانگلن بھی باغیوں کے ساتھ شریک ہے، لے

۱۔ اقبال نامہ جاگیر صفحہ ۱۷۱ و ۱۷۲ تاریخ ہند مولانا کا ۱۱۱۱ء جلد ہشتم صفحہ ۵۸

۲۔ جاگیر صفحہ ۱۳۲

نوٹ :- سرحد و ناتھ سرکار اس مضمون کے سلسلہ میں میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر پرنی پرشاد کی یہ دلیل کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ رامپوری پرشاد جنگلی تاریخ ہند ہائے صوبہ کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے، نے بھی لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ شیرانگلن افغانوں کی بغاوت میں شریک تھا۔ میں ایک دوسرے مضمون ”عثمان خاں کی بغاوت“ پر لکھ رہا ہوں میرے اس مضمون کے پڑھنے کے بعد نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آیا شیرانگلن بغاوت میں شریک تھا یا نہیں

ظاہر ہے یہ شبہ جہانگیر کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا کہ وہ جس کو اوس نے جاگیر و خطاب دیا ہو عزت بخشی ہو سرپرستی کا ذمہ لیا ہو خود اوس سے باغی ہو جائے !!

جیمس برگس (James Burgess) لکھتا ہے :-

۱۲۔ اکتوبر ۱۵۷۷ء کو قطب الدین بنگال بھول بہار کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے، اوس کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ شیر افگن علی قلی استجلو، مہر النساء کے شوہر کو دربار میں بھیج دے۔
شیر افگن جانے سے صاف انکار کرتا ہے، آخر کار آپس کی ایک جھڑپ میں ایک دوسرے کی

جان جاتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اس شبہ پر کہ شیر افگن باغیوں سے ملا ہوا ہے۔ اس کا بنگال میں رہنے دینا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے اس کو بلواتا ہے۔ اقبال نامہ جہانگیری کے بیان سے (James Burgess) جیمس برگس کے بیان پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ قطب الدین بنگال کیوں بھیجا گیا؟ شیر افگن کی طلبی کی کیا وجہ تھی؟ شیر افگن کی ہندوستان میں آمد، اکبر کے دربار میں رسائی، جہانگیر کا اس کو خطاب اور جاگیر کا دینا، بیان کرتے ہوئے مصنف اقبال نامہ لکھتا ہے :-

”مگر معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کا خمیر فتنہ جوئی اور شورش پسندی سے مرکب ہے“

قطب الدین بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوتا ہے، جانے وقت جہانگیر ہدایت کرتا ہے :-

”اگر وہ (شیر افگن) راست کرداری پر قائم رہے، تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے،

ورنہ ہمارے پاس بھیج دیا جائے، اور اگر آئے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے“۔

قطب الدین بنگال پہنچ کر شیر افگن کو طلب کرتا ہے، وہ حاضری سے انکار کر دیتا ہے، قطب الدین کو اس کی اس حرکت سے ”شبہ“ ہوتا ہے، اس کی اطلاع دربار میں کی جاتی ہے، جہانگیر کا دوبارہ حکم آتا ہے :-

”اوس کو روانہ کریں اور اگر اس کے اطوار سے بداندیشی کا اندازہ کریں۔ تو جس طرح نصحت

ہونے وقت ہدایت ہوئی تھی اوس ناہنجار کو سزا دیں“۔

قطب الدین دوسرا حکم نامہ پاتے ہی شیر افگن کے یہاں خود جاتا ہے، تاکہ اوس کو ”گرفتار“ کرے۔ گورنر کی آمد کی خبر

۱۔ اقبال نامہ صفحہ ۱۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً صفحہ ۱۸

سُن کر شیر افگن دو جلاووں کی معیت میں آتا ہے، موقع پا کر قطب الدین کے پیٹ میں تلوار بھونک دیتا ہے قطب الدین لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ منیر خاں کاشمیری آتا ہے، شیر افگن پروار کرتا ہے، اور خود غریب کاشمیری ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس عرصہ میں قطب الدین کے آدمی موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور شیر افگن کو اوس کے کئے کی سزا دیتے ہیں لے۔

جہانگیر کو جب قطب الدین کے مارے جانے کی خبر ملتی ہے تو وہ شیر افگن کو اس طرح پر یاد کرتا ہے :-

مردم ہجوم آردہ و اورا پارہ پارہ ساختند و بہنم فرستادند امید ہمیشہ در جہنم جاتے آں بخت

روسیا ہ بودہ باشد لے

یہ ہے شیر افگن کی قتل کی ساری داستان ! باغی اور سرکش کی سزا ہمیشہ قتل و پھانسی ہو ا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ شیر افگن کے متعلق خود جہانگیر اور گورنر دونوں کو ”صرف شبہ“ تھا، اس لئے جہانگیر قطب الدین کو تاکید کرتا ہے :-

(۱) اگر خیر خواہی و راست کرداری پر قائم رہے تو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے،

پھر تاکید اکدیتا ہے اگر ایسا نہ کرے،

(۲) تو ہمارے پاس بھیج دیا جائے،

پھر حکم دیتا ہے،

(۳) اگر آتے میں تساہل کرے تو سزا دی جائے،

اس ساری تفصیل کے بعد ظاہر ہے کہ کون سی سزا مقصود تھی؟ بلاشبہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ شیر افگن قتل ہوا، لیکن کیوں اور کس لئے؟ کیا اس لئے کہ جہانگیر کو مہر النساء سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اسے اپنی شریک زندگی بنانا چاہتا تھا یا اس لئے کہ شیر افگن نے اپنی بیوی کو جہانگیر کی مرضی کے موافق طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا؟ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ شیر افگن کا جو بھی حشر ہوا وہ اوس کے کئے کی سزا تھی۔ بغاوت و سرکشی، فتنہ و فساد، سازش و ریشہ دوانی، اور سب سے بڑھ کر شہنشاہ کے حکم کی نافرمانی، شیر افگن کا سب سے بڑا جرم تھا۔ جیسا کہ جہانگیر نے لکھا تھا اگر وہ راہ راست پر آجاتا تو نہ وہ قتل ہوتا نہ جہانگیر غریب کو نئے نئے قسم کے افسانے گھر گھر سارے زمانے میں رسوا و بدنام کیا جاتا !

اب میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جہانگیر نے نور جہاں کو شیر افگن کے قتل کے بعد دیکھا، جیسا کہ *Pet. Della Vella* (پٹرو ڈیللا ویلا) نے لکھا ہے، یا اگر اوس سے پہلے دیکھا بھی ہو تو یہ کوئی ضرور نہیں ہے، کہ اوس سے اوس کو عشق بھی ہو گیا ہو، اگر ایسا تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ جہانگیر جس کسی خوبصورت

عورت کو دیکھتا تھا۔ اوس سے اوس کو عشق و محبت ہو جاتی تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔
 نور جہاں شیر افگن کے قتل کے بعد دربار میں بھیج دی جاتی ہے۔ جہانگیر اس کو اپنی سوتیلی ماں رقیہ سلطانہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں دربار میں بھیج دی جاتی ہے، قطب الدین کے مارے جانے کا جہانگیر کو بے حد ملال تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر شیر افگن تعمیل حکم میں بے اعتنائی و تغافل سے کام نہ لیتا، تو آج اوس کے مرحوم بھائی کو موت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا

ایک مدت تک یہ لڑکی (مہر النساء) رقیہ سلطانہ کے پاس ناکامی و کس پرسی کے ساتھ بسر کرتی رہی، جب آخر مراد کے طلوع، اور کوکب بخت کی ضیا پاشی ہوئی، اقبال نے استقبال کیا، طالع خواب گراں سے بیدار ہوا، سادات نے منہ دکھایا، دولت جلد آ رہی، (انہ صرف مشاطگی ہوا۔ ہوس چلنے لگی۔ اُسیدیں بڑھنے لگیں، آرزو میں ہر طرف سے گھیرنے لگیں، درہائے بستہ کی کلید مل گئی، دل ہائے بستہ نے دوا پائی۔ حاصل کرشمائے آسمانی سے ایک دن جشن نوروز میں جہان پناہ کی منظور نظر ہوئی۔ پرستانِ حرم سراے کے گردہ میں شامل ہو کر، عزت و مراتب ارتقاء میں عروج حاصل کرتی ہوئی، علوی منصب کے آخری منزل پر پہنچ گئی، پہلے "نور محل" نام رکھا گیا پھر چند روز بعد "نور جہاں بیگم" کا خطاب عطا ہوتا ہے وہ وہ

عشق، ماں، باپ، بھائی، بہن، عزیز واقارب، کی محبت سے کہیں بلند و بالا ہوا کرتا ہے۔ اگر واقعی (جیسا کہ مورخین لکھتے ہیں) سلیم کو مہر النساء سے محبت ہو گئی تھی، اور یہ دیوانگی و عشق کا اثر تھا کہ وہ مہر النساء کو ہر جائز و ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا، تو قطب الدین کے مارے جانے کے صدمہ کو، مہر النساء کے عشق پر غالب نہ آنا چاہئے تھا۔ نور جہاں کے ساتھ جہانگیر کا تغافل، اور اس کی بے اعتنائی، صاف بتا رہا ہے۔ کہ سلیم کو مہر النساء سے عشق تو کجا اُنس تک نہ تھا۔ اور یہ غصہ و رنج تو اوس وقت ہو سکتا تھا جب یہ معلوم ہوتا کہ قطب الدین کے قتل میں اُس کا بھی کوئی ہاتھ تھا۔ شیر افگن کے قتل کے متعلق جتنی تاریخی شہادتیں بھی ہیں اُن سے اشارتاً و کنا بتایا بھی یہ پتہ نہیں ملتا، کہ قطب الدین کے

۱۔ مہر النساء، اور اس کی لونڈیوں کے لئے روزینہ خرچ کے لئے صرف ۴۴ مقرر کیا جاتا ہے تاریخ ہندوستان (History of India by Dow) صفحہ ۶

۲۔ اقبال نامہ جہانگیر صفحہ ۱۵ و ۱۶

۳۔ ۱۱۱۱ میں نور محل و مارچ ۱۱۱۲ میں نور جہاں۔ جہانگیر (پروفیسر مینی پرشاد

مارنے میں مہر النساء کی بھی کوئی سازش تھی، ایسی حالت میں جہانگیر کے غصہ و رنج تغافل و بے مہری کی یہ ساری داستانیں کتنی مہل و بے سرو پا ہیں

درحقیقت یہ سب کچھ صرف اس لئے گھڑا گیا ہے تاکہ ڈرامے کے تمام سین پوری طرح مکمل ہو جائیں بیان کردہ واقعات کی تصویر میں، اگر آپ غور سے دیکھیں گے، تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا، کہ جہانگیر کا عشق و محبت اوس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد مستقلاً دربار میں آکر رہ جاتی ہے۔ نور جہاں حسن و جمال میں یکتا تھی اوس میں اس کے دیکھنے والوں کیلئے کشش و جاذبیت تھی۔ سلیم سب کچھ سہی، لیکن ذوق سلیم رکھتا تھا، وہ اگر مہر النساء کی ان تمام خوبیوں کے باوجود اس سے لاپرواہی برتا اور اسے گوشہ گمنامی میں چھوڑ دیتا تو آج ہم اسے بد ذوق کہتے

اس وقت تک جہانگیر و نور جہاں کی ملاقات اور شیر افگن کے قتل کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اوس سے پوری طرح یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سلیم نے مہر النساء کو جب بھی اور جہاں کہیں بھی دیکھا ہو اس سے اس کو عشق یا اس کا شیدائی نہ تھا۔ اور شیر افگن اگر قتل ہوا تو اس لئے نہیں کہ بد قسمتی سے وہ مہر النساء کا شوہر تھا بلکہ وہ مجرم تھا اور مجرم کی سزا جو ہونی چاہئے تھی وہ اس کو ملی

اب میں اپنے مضمون کے تیسرے حصہ سے بحث کروں گا۔ اور دلیں و ثبوت کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس الزام کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے۔ کہ جہانگیر نااہل و ناکارہ امور سلطنت سے بے سرو کار تھا، اور سلطنت کی ساری ذمہ داری نور جہاں پر تھی۔ اور وہی سیاہ و سفید کی مالک تھی، جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی چونکہ جہانگیر کے حسن و عشق کے افسانے کو اس قدر طول دے دیا گیا تھا اس لئے اس کی ضرورت پڑی کہ جہانگیر کو نااہل و ناکارہ امور سلطنت سے بے سرو کار عیاش و آرام طلب سب کچھ بنا دیا جائے، تاکہ آنے والی نسلیں جب جہانگیر کے متعلق کچھ پڑیں تو صرف یہ ہی نہیں جانیں کہ وہ شرابی و کبابی عیاش و آرام طلب بدکار و نااہل تھا بلکہ اپنے لائق باپ کا نا لائق بیٹا تھا، اس میں حکومت و حکمرانی کی قطعی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اور ان باتوں کو ہمارے مورخین نے نہایت آب و رنگ کے ساتھ بھی بیان کیا ہے

اس سلسلے میں تین سوالات یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) کیا یہ حقیقت ہے کہ جہانگیر میں حکومت کی صلاحیت مفقود تھی

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فقدان صلاحیت کب سے شروع ہوا، کیا جہانگیر شروع ہی سے حکمرانی کا نااہل تھا، یا نور جہاں کے آنے کے بعد سے اس کی ابتدا ہوتی ہے؟ سنہ ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تخت نشین ہوتا ہے

اور اسلئے میں نور جہاں اس کی شریک زندگی بنتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چھ برس کے عرصہ میں اس نے حکمرانی کس طرح کی اگر واقعتاً اس کا ثبوت مل جائے کہ جہانگیر تخت نشینی کے بعد سے نور جہاں سے شادی تک نہایت تدبیر ہوشیاری اور جس طرح ایک لائق بادشاہ کو حکومت کرنی چاہئے کی تو پھر یہ سلسلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ ۱۶۰۷ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ "لائق حکمران" تھا

"اس شاندار اور لائق حکمران کی سلطنت میں دن و رات چوگنی، ترقی ہوتی رہی"

تخت نشین ہوتے ہی، سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ کہ *Transit*

duties (بندوں پر *Pol tax*) (جزیہ)

نیز یتیموں کی جائداد سے، سمندر، اور کانوں کی پیداوار سے تقریباً ہر قسم کا ٹیکس اٹھا دیا۔

"اس کی سب سے پہلی کارروائی نہایت منصفانہ اور کارآمد تھی، اس نے اپنے والد

(اکبر) کے وقت کے تقریباً تمام وزراء کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا، اس نے اُن تمام

Taxes (کو موقوف و بند کر دیا جو نہایت قابل اعتراض اور

تکلیف دہ تھے۔ اور جو اکبر کے زمانہ میں بھی موجود تھے، ہر شخص کو اجازت تھی کہ جب اور

جس وقت چاہے، سلیم سے اگر اپنے در و دکھ کی شکایت بیان کرے۔ لیکن یہ اطمینان دیکھو

اور خوش حالی و نارغ البالی خسرو کی بغاوت کی وجہ سے درہم برہم ہو گئی"۔

ایک شخص جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت و قابلیت ہو، وہ بلا کسی وجہ و سبب کے حکومت دوسروں کے سپرد کر دے،

د عقل کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے میں کام کرنے کی اہلیت نہ پا کر دوسروں کے سپرد کر دے، لیکن

ایسا کرنا انسانی فطرت کے بالکل منافی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان اپنے میں کام کرنے اور اس کو باحسن و جوہ کرنے کی صلاحیت

رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو دوسروں کے سپرد کر دے۔ ایسا وہی لوگ کرتے ہیں اور اس کی آئے دن بیشتر مثالیں مل کر کرتی

ہیں کہ جب کسی ناکارہ و نااہل کے سپرد کسی قسم کی ذمہ داری کر دی جاتی ہے۔ تو وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے اس سے علیحدہ

ہی، ہٹنا چاہتا ہے۔ جہانگیر اُن عیاش و نفس پرست حکمرانوں کی طرح نہ تھا، جن کا تنہا مشغلہ ناچ و رنگ، شراب و کباب،

عیاشی و بدکاری تھا۔ بلاشبہ وہ زاہد خشک نہ تھا۔ وہ زندہ دل، اور صاحب ذوق تھا۔ وہ شراب پیتا تھا، ناچ و رنگ کی

۱۔ سلسلہ صفحہ (۱۳) ۲۔ تاریخ اسیتہ ۳۔ *Smith* ۴۔ ۲۱ اکتوبر ۱۶۰۷ء

۵۔ ایضاً

۶۔ وقائیہ اسدیگ صفحہ ۳۰

۷۔ مارشمن ۸۔ *Marshman* ۹۔ صفحہ ۶۳

محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کا تنہا مشغلہ نہ تھا وہ ان تمام چیزوں کا دلدادہ و شیدائی ہونے کے باوجود بھی ایک بیدار مغز، رحم دل، اور منصف مزاج حکمراں تھا۔
خبر و بغاوت کرتا ہے، دربار میں خبر پہنچتی ہے، امیر الامرا جہانگیر سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے دیکھو بادشاہ کن الفاظ میں حکم دیتا ہے :-

”اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو مجرم کی جو سزا ہونی چاہئے اس کے دینے میں تمہیں ذرا

ناہل نہ ہونا چاہئے۔ ملوکیت باپ دبیٹے کے رشتہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی اور یہ سچ کہا گیا

ہے ایک بادشاہ اس قسم کے جھگڑوں سے بالاتر ہوتا ہے۔“

ان جگہوں کو بار بار پڑھئے اور اندازہ لگائے کہ کیا اس قسم کے الفاظ کسی ناکارہ و نااہل، عیاش و آرام طلب حکمراں کی زبان سے نکل سکتے ہیں؟ جواب نفی میں ہوگا

اب نورجہاں کی شادی اور اس کے اثر و رسوخ کے بعد سے جہانگیر کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ۱۶۱۱ء یعنی شادی کے بعد سے اس نے حکومت کس طرح کی؟ اگر یہ صحیح ہے کہ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۱ء تک وہ نہایت بیدار مغز، منصف مزاج، اور رحم دل حکمراں تھا۔ تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر جہانگیر میں اس قسم کی تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی؟ جہانگیر خود لکھتا ہے :-

”میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو گمراہ کن مشورہ کے قبول کرنے سے باز رکھا، میری ساری

کارروائی، میری اپنی ہی سمجھ، اور میرے اپنے ہی تجربے پر مبنی رہی ہے، میرے دل میں

والد مرحوم، اور میرے مذہبی پیشوا (شاہ سلیم چشتی) کا یہ مشورہ ہمیشہ جاگزیں رہا کہ بادشاہ

اور شاہزادے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں ایک پیش بینی و دانائی اور دوسری

کامیابی و فتح پابی۔“

لوگوں کا یہ گمان بلکہ یقین کہ جہانگیر نورجہاں کے آنے کے بعد سے سلطنت کی تمام ذمہ داریوں سے علیحدہ و سبکدوش ہو گیا تھا، کہاں تک صحیح ہے؟ انفعول الاخبار کے ذیل کے سطور سے اس کی پوری پوری تحقیق ہو جاتی ہے

”اس وقت اپنی مستند مدد میں عزیز دامبر، ادنیٰ داعی سب یکساں طور پر خوشحالی

فارغ البالی، اطمینان و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور لوگ اندرونی اور بیرونی تمام خطرات سے محفوظ ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ خدا کی درگاہ میں بادشاہ کے عروج و ترقی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں جو ان کی نظریں سلطنت کا محافظ اور خدا کا سایہ ہیں۔

ملک کی یہ حالت نورجہاں سے شادی کے سات برس بعد (۱۶۵۷ء) کی ہے۔ پھر یہ الزام کس طرح عاید ہو سکتا ہے، کہ جہانگیر نورجہاں سے شادی کے بعد ہی سے، سلطنت کے جھگڑوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں (موت سے کچھ دن پہلے) ایک دور ایسا بھی آتا ہے، جب وہ تھک گیا تھا، اور سلطنت کے بارِ عظیم کو تنہا نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اس کی ضرورت ہو گئی تھی کہ امور سلطنت کی انجام دہی میں وہ اپنے خیر خواہوں اور ہمدردوں سے بھی مدد لے، یہ دور اس کی ضعیفی اور بڑھاپے کا ہے، اس وقت وہ کوئی کام بغیر آصف خاں، نورجہاں اور دوسرے مہران سلطنت کے مشورہ کے نہیں کرتا تھا لیکن اس وقت تک جب تک اس کے قویٰ مضحمل نہیں ہوئے تھے۔ اس کی صحت اچھی تھی، اور جب تک وہ تنہا سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کو کسی کی محتاجی نہیں ہوئی۔ علامہ شبلی "جہانگیر و تزک جہانگیری" میں لکھتے ہیں:-

"ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ مہات پر فوجیں بھیج رہا ہے۔ کبھی ایک غریب بڑھیا کی ایک طاقت ور درباری کے مقابلہ میں داد رسی کر رہا ہے، کبھی علاقہ کی بیابان میں مصروف ہے، کبھی صوبہ جات کے گورنروں کے نام احکام جاری کر رہا ہے، کبھی ملکی تحقیقات میں مصروف ہے، کبھی سرحدی حکمرانوں سے تعلق پیدا کر کے اس کو مستغنی کر رہا ہے، کبھی علماء کی مجلس میں شریک ہے، کبھی غیر مذہب والوں سے علمی مباحثے کر رہا ہے، ایسی حالت میں جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو دربار بے نشاط و فتنہ و سرور سے بھی دل ہٹا لیتا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو سب کو اس جرم کا مرتکب ہونا چاہیے!

ماہ سے می غور و مذاہ پار سامی باش

جہانگیر کے متعلق مؤرخین کی یہ غلط فہمی، درحقیقت ذیل کی تین باتوں کی وجہ سے پیدا ہوئی،

- (۱) جہانگیر کی نورجہاں سے غایت محبت،
- (۲) سکون پر نورجہاں کا نام، اور اس کی تصویر، اور نیز شاہی فرمان پر اس کے دستخط،
- (۳) نورجہاں کی بیٹی (لاڈلی بیگم) کی نسبت پہلے فرخ (شاہ جہاں) سے، لیکن بعد کو بجائے فرخ سے اس کی شادی شہریار سے ہوتی ہے،

اسی سلسلہ میں یہ بتا چکا ہوں، کہ جہانگیر نورجہاں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس سے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ ۶۰ برس بھٹتا تھا۔ ہولڈن (Holden) لکھتا ہے کہ جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کے بعد ایک مرتبہ کہا تھا کہ :-

”اُس سے (نورجہاں) شادی سے قبل میں شادی کے اصلی مفہوم سے بالکل

نا آشنا تھا“ ۱

جہانگیر کی یہ فریفتگی اس وقت تھی جب کہ نورجہاں کی عمر پچیس برس (۲۵ برس) ۲ تھی لیکن باوجود اس کے کہ اس کا سن زیادہ ہو چکا تھا اس کی کشش و جاذبیت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں پیدا ہوا تھا وہ اس وقت بھی جہانگیر کے لئے جوان تھی، خوبصورت تھی، حسین تھی، اس کی ہر ہر ادا اس کے لئے ایک خاص اثر و کیفیت رکھتی تھی، نورجہاں پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب کبھی بیمار پڑتا تو طبیبوں کو یہ کہہ کر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیتا کہ :-

”نورجہاں میرے لئے کافی ہے“

لیکن باوجود اس دیوانگی و عشق کے جو جہانگیر کو نورجہاں سے تھا ایک مرتبہ جب نورجہاں ایک شخص کو اپنے ماہتابی سے گولی مار دیتی ہے اور قاضی کا فیصلہ نورجہاں کے خلاف ہوتا ہے تو جہانگیر حکم دیتا ہے کہ نورجہاں کشاں کشاں درہاڑیں لائی جائے لیکن کسی طرح مقتول کے وارثوں کو ایک کثیر خوں بہادے کر اپنی برایت کرائی ہے اس واقعہ کے بعد جہانگیر محل میں جاتا ہے اور بے ساختہ نورجہاں کے پاؤں پر گر پڑتا ہے اور کہتا ہے :-

”تو اگر گشتہ شدی آہ چہ می کردم من“ ۳

گو اس واقعہ کو بہت سے لوگ صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے اس واقعہ کو صرف ضرورت شعری کے لئے ”تصنیف“ کیا تھا، خواہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط لیکن اس سے دو اہم نتائج ضرور اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہانگیر صحیح معنوں میں منصف مزاج تھا اور دوسرے یہ کہ اس کو نورجہاں سے بے حد محبت تھی، اس کا پیروں کو پکڑ کر یہ کہنا صاف بتا رہا ہے کہ جہانگیر نورجہاں کا شیدائی و دیوانہ تھا۔ اس سے اس کو سچا عشق تھا اور حقیقت ہے کہ نورجہاں سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا ہونا اُس پر شاق گذرتا تھا ۴ اکثر وہ نورجہاں کو سامنے بٹھا کر پردوں

لیکن لین ہول (Lainhol) لکھتا ہے کہ اس وقت نورجہاں کی عمر ۳۴ برس کی تھی صفحہ ۳۱۷ و ۳۱۸
 The Moghal Emperor of India by Holden صفحہ ۲۲۶ و ۲۲۷
 Indian History by Rameshwar Prasad صفحہ ۲۹۳

جہانگیر دنگ جہانگیری از علامہ شبلی

جہانگیر از پروفسر بینی پرشاد صفحہ ۱۳۹

دیکھتا رہتا تھا۔ اور جب دربار کرتا تھا تو نور جہاں اس کی پشت پر پردہ میں بیٹھی ہوتی تھی۔ جہانگیر شراب بہت پیتا تھا، جب تک نور جہاں خود سے ڈھال کر اسے پیش نہ کرتی تھی وہ نہ پیتا۔ اس طرح نور جہاں کو اس کا موقع ملا کہ وہ جہانگیر کی شراب کی کثرت کو کم کرے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اپنی آخری عمر میں بہت کم پینے لگا تھا۔ تھا جہانگیر و نور جہاں کی محبت کا عالم !

جہانگیر بیمار ہو کر کشمیر جا رہا تھا راستہ میں آصف خاں اور مہابت خاں سے ایک جھڑپ ہوتی ہے۔ آصف خاں شکست ہوتی ہے اور وہ بنارس میں پناہ لیتا ہے۔ اور مہابت خاں بادشاہ کا محاصرہ کرتا ہے اور جہانگیر گویا مہابت خاں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتا ہے، نور جہاں بھی ساتھ گرفتار ہوتی ہے لیکن موقع پا کر نکل بھاگتی ہے اور تھوڑی سی فوج اکٹھا کر کے، مہابت خاں سے جنگ کرتی ہے، اور خوب لڑتی ہے، اور خوب خوب اپنا ہنر دکھاتی ہے، اور اس طرح جہانگیر کو ذلت و مصیبت سے نجات ہوتی ہے۔ نور جہاں کا مہابت خاں اور اس سے اس کو کس قدر محبت تھی، لیکن اگر ان حالات کے ماتحت جہانگیر نے کبھی نور جہاں کے نام پر سکے جاری کر دیے، شاہی کاغذات پر کبھی اس کے دستخط ہو گئے ہوتے، تو اتنی سی بات پر ہمارے مورخین کا یہ فیصلہ کہاں تک درست ہے، کہ جہانگیر عضو معطل تھا اور نور جہاں جزو کل تھی، اور جو چاہتی تھی، اور جیسے چاہتی تھی کرتی تھی۔

جو لوگ عشق و محبت کے نفسیاتی پہلو سے واقف ہیں، وہ نہایت آسانی سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب صحیح معنوں میں کسی سے خلوص و محبت ہوتی ہے تو پھر آپس میں کسی قسم کا امتیاز و فرق باقی نہیں رہتا، اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس قسم کی بیشتر مثالیں ہمیں آئے دن روزمرہ کی زندگی میں ملنا کرتی ہیں۔ میں خود دو دوستوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ جانتا ہوں کہ ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا۔ تو اگر شہنشاہ جہانگیر نے کبھی نور جہاں بیگم کے نام سے سکے جاری کر دیا، شاہی فرمان اور کاغذات پر بجائے خود دستخط کرنے کے اس سے دستخط کر دیا، تو کون سا جرم ہو گیا، اور اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عنان حکومت بھی نور جہاں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ درحقیقت یہ سب کچھ جہانگیر کی غایت

۱۔ تاریخ ہندوستان آرٹیلر و العقول اخبار صفحہ ۲۲۸

۲۔ مورلینڈ (Jahangir's India by Morland) لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے احکام اور عطیات

پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہوتا تھا جب تک کہ ملکہ کی منظوری نہ ہو جاتی تھی۔ صفحہ ۵۰ لیکن فرانس برنیر

(Francis Bernier) (Extraordinary Domination) کے متعلق عبارت

زور دار الفاظ میں لکھتا ہے لیکن اس قسم کی ایک مثال بھی ثبوت میں پیش نہیں کرتا۔ جہانگیر ادبئی پشاد صفحہ ۱۳۶

محبت کا اثر تھا کہ وہ اپنے اور نور جہاں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں پسند کرتا تھا۔ اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جب سے نور جہاں کی شادی ہوئی تھی اوس وقت سے لے کر جہانگیر کی موت تک برابر ملکہ ہی کے نام پر سکے جاری ہوتے رہے۔ اور شاہی فرمان و کاغذات پر برابر اوس کے دستخط ہوا کرتے۔
 پروفیسر بینی پر شاد لکھتے ہیں :-

”کبھی کبھی اوس (نور جہاں) کے نام سے بھی سکے جاری ہوئے اور بعض فرامین

پر اس کے دستخط بھی پائے جاتے ہیں“

پروفیسر موصوف اسی سلسلہ میں نوٹ دے کر لکھتے ہیں :-

”معمد خاں لکھتا ہے کہ تقریباً تمام فرامین پر نور جہاں ہی کے دستخط ہو کر رہے تھے لیکن یہ نکل

غلط ہے بعض فرامین جن کا میں نے خود پتہ لگایا ہے اس پر نور جہاں کے دستخط نہیں ہیں اور

بہت سے سکے جن کی تصویریں بین پول (Lainpol) نے دی ہیں :-

اون پر اوس کا نام ہے“

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی شہنشاہ محل میں ہوں گے اور ملکہ نور جہاں ساتھی گہری کے فرایض انجام دے رہی ہوں گی ایسی حالت میں اگر کوئی فرمان دستخط کے لئے پیش کیا ہو گا تو انہوں نے نور جہاں کا ہاتھ پکڑ کر یہ کیا ہو گا۔
 ”بیگم اس فرمان پر بجائے میرے تم دستخط کر دو“

اسی طرح پر کبھی نور جہاں کے دستخط فرمان پر ہو گئے ہوں گے اسی طرح کبھی عالم سرور میں یہ کہہ دیا ہو گا کہ بجائے اس کی تصویر کے نور جہاں بیگم کی تصویر بنادی جائے

نور جہاں کے اس خود ساختہ اثر و اقتدار کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوئی، اوس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ شیر افگن سے اسے ایک بیٹی (لاڈلی بیگم) تھی جس کی شادی وہ شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) سے کرنا چاہتی تھی اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اس نے اپنے ہونے والے داماد کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ پروفیسر بینی پر شاد لکھتے ہیں :-

”کہ جب وہ خرم کی دوست تھی تو اس نے اس کو شاہزادگی کے انتہائی عروج پر پہنچا دیا،

اور جب وہ اُس کی دشمن ہو گئی تو اس نے اس کو ذلیل و خوار کر دیا“

واقعہ یوں ہے کہ نور جہاں اپنی لڑکی لاڈلی بیگم کی شادی شاہزادہ خرم سے کرنا چاہتی تھی، اور آصف خاں بھی اپنی بیٹی ممتاز محل کی شادی خرم ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ خرم بلند خیال، حوصلہ مند، اور دور اندیش تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ لاڈلی بیگم سے شادی کرتا ہے تو اس کو سلطنت کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد نہیں ملے گی۔ برخلاف اس کے اگر وہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل سے شادی کرتا ہے تو آصف خاں سے مدد کی بہت زیادہ توقع ہے اور یہی ہوا خرم کی شادی ممتاز محل سے ہو گئی۔ نور جہاں کو اس کا سخت رنج ہوا۔ اب اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا، کہ وہ لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے کر دے۔ نور جہاں خوب جانتی تھی کہ شہریار جہانگیر کے تمام بیٹوں میں سب سے زیادہ نااہل و ناکارہ، جاہل و بد سلیقہ تھا۔ آخر مجبوراً لے لاڈلی بیگم کی شادی شہریار سے ہو گئی فطرتاً نور جہاں کی محبت و ہمدردی خرم کی طرف سے شہریار کی طرف منعطف ہو جانی چاہیے تھی اور ہوئی۔ اور اس کی ساری کوشش اب اس میں صرف ہوتی تھی کہ وہ جہانگیر کو خرم کی طرف سے بدظن و بدگمان کر دے۔ اور بجائے خرم کے ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث شہریار کو بنادے۔ ایک عورت اپنے حصول مقصد کے لئے جو کچھ کرتی ہے یا کر سکتی ہے وہ نور جہاں نے بھی کیا۔ اپنے داماد شہریار کے لئے شاہزادہ خرم کی دشمن ہو گئی۔ اور بھائی سے ہمیشہ کے لئے بگڑ گئی اور ہر جائز و ناجائز طریقہ سے وہ شہریار کی مدد و پاسداری کرنا چاہتی تھی اور اس نے کی

ایک شخص جس میں تھوڑی بہت بھی صلاحیت و اہلیت ہوتی ہے وہ تھوڑی سی مدد کے بعد خود سے اپنی راہ نکال لیتا ہے لیکن جو غریب خود ہی عقل و سمجھ سے معذور ہو۔ اور اس میں اہلیت و صلاحیت کا فقدان ہو اس کی لاکھ ہمدردی کیجئے، مدد کیجئے، اس کو راہ بتائے، وہ جہاں اور جس جگہ پہنچے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی حال غریب شہریار کا تھا۔ جتنی کچھ مدد نور جہاں نے اس کے لئے کی تھی اگر شہریار کی جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اپنی بہتری و بھلائی کی راہ خود نکال لیتا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی نور جہاں نے کیا اس سے بھی لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ جہانگیر پر حاوی تھی اور سلطنت کے نظم و نسق کا دار و مدار اسی پر تھا۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے وہ جہانگیر کو اس بات پر مجبور کرتی کہ وہ خرم کو مجبور کرے کہ وہ لاڈلی بیگم ہی سے شادی کرے اور جہانگیر سے یہ کہتی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں شہریار کے حق میں وراثت کا اعلان کرے۔ لیکن اس میں اتنی عقل و سمجھ تھی اور وہ شہریار اور لاڈلی بیگم کی محبت میں اس قدر یا گل نہیں ہو گئی تھی کہ ان باتوں کے آئندہ نتائج پر غور نہ کرتی اس لئے اس نے جہانگیر کو کبھی بھی اس کے لئے مجبور نہیں کیا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں وراثت کا اعلان کرے اب ان تمام تفصیلات کے بعد ہر شخص اپنی اپنی عقل و سمجھ کے مطابق جہانگیر کی اہلیت و نا اہلیت اور نور جہاں کے اثر و اقتدار کے متعلق خود فیصلہ کرے

شاہ محمد زہیر (زہیری)

مکتوبات نیاز

گزشتہ ماہ سے ”مکتوبات“ کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اُن کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے، لیکن اس کے اجراء پر اس قدر اصرار ہوا کہ دوبارہ پھر اس کو شروع کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ جب یہ ”کتاب“ کی شکل میں شائع ہو تو نصف سے زیادہ غیر مطبوعہ مکتوبات بھی اس میں شامل ہوں۔

نیاز نواز اکرم گسٹرا۔

اس دل پُرسی کا شکریہ ادا کر دوں بھی تو کیونکر جبکہ ہر اعتراف احسان پر آپ کی طرف سے تازہ بارشِ کرم کے تماشے بارہا دیکھ چکا ہوں۔ اے حُسنِ طلب نہ سمجھئے۔ یہ داستان ہے اُس ”حُسنِ عطا“ کی جو ”وجودِ تمنا“ نہیں بلکہ اس کا ”امکان“ بھی کسی دل میں نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ زمانہ سے آپ کی صحت کے متعلق متوحش خبریں سُن رہا تھا، اس لئے عرض بھیجا تھا۔ لیکن آپ نے با اینہم ضعف و ناتوانی اُلٹی میری ہی تیمارداری شروع کر دی۔

اگر ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے منصبِ خدائی مل جاتا، تو آپ کو معلوم ہے میں کیا کرتا؟ — خضرِ الیاس کی عمر میں چھینکر آپ کو دیدیتا اور ”مولوی“ کا جذبہ پیرافشانی خود لے لیتا۔ وہ اس لئے کہ آپ کی حیات آپ کے دلولہ کرم کا ساتھ دے سکے اور یہ اس لئے کہ بڑھا ہونے کے بعد بھی جوان بنارہوں —

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب مکرر عرض کرتا ہوں کہ چند روز کے لئے تبدیلِ مقام ضروری ہے۔ آپ کے لئے سرد و خشک ہوا کی ضرورت ہے اور موسمِ سرما میں اس کا موقعہ بند لکھنؤ سے بہتر اور کہیں نہیں مل سکتا — یہ میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ آج کل خود میرا قیام اس سرزمین میں ہے، بلکہ صرف اظہارِ حقیقت و واقعہ مقصود ہے — یہ جگہ یقیناً ریل سے ۵۰ میل دور ہے، لیکن باور کیجئے کہ یہی مسافت آپ کو صحیح و توانا بنادے گی — جس وقت آپ پتہ سے نکل کر پہاڑوں کے پُرپیچ راستوں سے ہوتے ہوئے رکووندے اور بارشگھار کی جھاڑیوں سے گزریں گے تو رنگ و بو سے متاثر ہو کر ایسا محسوس کریں گے گویا فطرت آپ سے سرگوشیاں کر رہی ہے، اپنی آغوش میں لئے ہوئے روح میں گدگدی پیدا کر رہی ہے اور آپ کے ماضی و مستقبل دونوں ”حال“ میں غرق ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر ایک بات اور ہے جو صرف کان میں کہنے اور اشارہ سے بتانے کی تھی — مگر مجبوراً لکھنا پڑتی ہے — کہ —

حزین کو بنارس میں ہر "برہمن بچہ" لچھن و رام نظر آیا تھا، یہاں قدم قدم پر "سیتا درادھا" کا سامنا ہے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ
بے پردگی دیوانہ طرح نقاب انگذنش

راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔ — بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابرؤں
میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر مہندی — اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں — قامت رعنا کی وہ ادا کہ چکدار نیزہ
بھی شرمنا جائے، کمر میں وہ بوج کہ مید کو بھی غار آئے —

آپ کو داندڑ آئے اور صرف یہ فیصلہ کرنے کے لئے آئے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس سے زیادہ دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے
یا نہیں —

آپ کا ہمیشہ

نیاز

جانِ عالم —

خط ملا۔ اس برہمن پر نثار ہو جائے، اس "تو سے نہیں بولوں رے" والی ادا کے قربان جائے — نظام رامپوری کا شعر یاد آگیا

اے جان کہو پھر اُس ادا سے

میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جانِ عالم" کے میں تمہیں "جانِ نیاز" لکھ سکتا — ہائے رے غالب!

(قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو)

کاشکے تم میرے لئے ہوتے)

سچ بتاؤ، یہ فنِ دلربائی تم نے کہاں سیکھا، کس سے سیکھا — کسی اور سے بے اعتنائی کا اظہار اور میرے باب میں یہ اعتبارِ ناز! —
کیوں بناتے ہو۔

ربطِ نہانِ غیر کا پردہ ہے ورنہ آپ

دشمن کے ساتھ صرفہ کریں رسمِ دراہ میں!

یاد کروں تو زندہ کیونکر رہوں اور جھوٹ جانوں تو تم سے تمہارا پندار کیونکر چھینوں — بہر حال خوش رہو کہ

گرچہ ہے کس کس خرابی سے ملے با اینہم

میرا ذکر تو تمہاری محفل میں آجاتا ہے۔

ہاں، میں الہ آباد گیا اور بالا بالالوٹ آیا، تم سے نہیں ملا اور قصدِ انیس ملا — کیونکہ جب مجھ پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو آپ کے پاؤں

میں مہندی لگی ہوتی ہے۔ اور جب آپ اس سے فارغ ہوتے ہیں تو میں جیب و دامن کی فکرِ رفو میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ جانے بھی دو!

کیوں ستاتے ہو، کیوں دل دکھاتے ہو؟

تمہیں اٹھکھیلیاں سوچتی ہیں ہم.....“

جانتے ہو اور خوب جانتے ہو کہ مجھ پر طعن و تشنیع کا اثر بالکل نہیں ہوتا، کیونکہ میری ہستی خود فطرت کا ایک ”طنز“ ہے اس لئے اپنی ”پرکاری“ کا ہدف کسی اور کو بناؤ، مجھے تو صرف تمہاری وہ ”سادگی“ درکار ہے جو غالباً اب کبھی میسر نہیں آسکتی۔ خدا حافظ۔ نیاز

مولانا محترم،

ممکن ہے اس ترکیب کو آپ غلط یا ثقیل قرار دیں، لیکن آپ کی شخصیت کا ”بھاری بھر کم پن“ ظاہر ہی نہیں ہو سکتا، جب تک لفظ مولانا کے ساتھ کسی دوسرے شاندار لفظ کا اضافہ نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا دم بھی غنیمت ہے، اور ہم تو خیر ”غنیمت“ ہمیں دریں گنبد سپر! !

فطرت کا کھنڈر اپن اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ہم رندوں کی جماعت میں آپ سا ”مولانا“ بھی اس نے شامل کر دیا۔ یعنی صورت کے لحاظ سے مولانا اور سیرت کے لحاظ سے ”مولانا تر“! اللہ رحم کرے ہم اور آپ دونوں پر۔ کیونکہ آپ کا ہم جیسا ہو جانا یا ہمارا آپ جیسا بن جانا دنیا کا سخت سانچہ ہوگا، اور کسی نہ کسی دن یہ ہو کر رہنا ہے۔

آپ کا خط ملا، پیارے مولانا، یہ کیا خبر سنائی کہ آپ ہجرت کر کے اجیر جا رہے ہیں۔ ہائے مولانا! اے مولانا! اے بھائی کچھ تو وصیت کئے جاؤ، کہ ہم لوگ کاشی پہنچ کر تمہاری یاد کس طرح تازہ کریں۔ وہاں کی گلیوں میں ٹھوکریں کھا کھا کر، یا دریا کے کنارے جامے لٹھا لٹھا کر۔

ہائے، ہائے، وہ کون ظالم ہے جس نے آپ سے کہہ دیا کہ اجیر کی طرف سنگ خوب سماتے ہیں، یہ کس نے آپ کے دماغ کو چکر کر مغرب سے مشرق کی طرف پھیر دیا، ارے وہ شقی کون ہے، جو ہمارے امام کو ہم سے چھیننے لے جا رہا ہے۔

یا اسفا! یا اسفا! !

یہ ہمیں یقین ہے کہ آپ جائے بغیر رہیں گے نہیں، اس لئے خدا کے لئے ادھر ہی سے ہوتے ہوئے جائے، اور ایک بار اور صورت دکھا دیجئے، کیونکہ معلوم نہیں وہاں پہنچ کر کثرت انوار سے آپ کی صورت شکل کیسی بن جائے۔

نوکری تو غالباً چھوڑ دی ہوگی، اور بیوی بچوں کو بھی زہر دیدیا ہوگا، اچھا ہے، اللہ اس آزادی اور آزادہ روی کو قائم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آسمان و زمین آپ ہی ایسے حضرات کے دم سے قائم ہے، ورنہ ہم شیاطین نے تو ان کے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔

ارشاد ہو تو ایک گیر و اتحاد یہاں سے رنگوا کر بھیج دوں اگر بالا بالا چلے جاتے گا ارادہ ہو۔ کشکول تو خیر اجیر ہی میں اچھا ملیگا۔

نیاز

ہاں بھی ————— آجکل طبیعت بہت مضطرب ہے اور کسی سے بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، لکھنا پڑھنا کیسا؟ آپ کے خط میں چونکہ ایک ضروری بات قابل جواب ہے اس لئے مجبوراً لکھنا پڑا۔

عزیز من، میں اس امر میں آپ سے متفق نہیں کہ میر صاحب قصداً آپ کی کار برآری میں حائل ہوئے۔ لاکھ وہ سب کچھ ہوں جو آپ کہتے ہیں، لیکن مکروفریب کی کوئی مثال ان کی زندگی میں مجھے اس وقت تک نہیں ملی — ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی امداد میں تساہل سے کام لیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وعدہ کریں اور ٹال جائیں، لیکن آپ کی مخالفت، یا آپ کی کوششوں کے خلاف سنی و کاوش، اُن سے قیامت تک ممکن نہیں — خیر، یہ تو وہ بات ہوئی، جس کا تعلق اس خود غرض اور حقیقت ناشناس دنیا سے ہے۔ لیکن میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ میں یہ ”خوئے التجا“ کب سے پیدا ہو گئی۔ پھر جو شخص سوال کا عادی ہو اُسے رد و قبول کے مسئلہ کو اتنی سنجیدگی سے نہ دیکھنا چاہئے، گدائی کرنا ہے تو گدا ہی کی طرح اُن جبر کیوں کو بھی سنئے جو فطرت انسانی کا معمولی مظاہرہ ہے — آپ کو معلوم ہے جب بیدل کو حیدر آباد جانے کی دعوت دی گئی تھی تو اس نے کیا جواب دیا تھا۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے، لیکن میں پھر اس کو دہراؤں۔ مجھے اس کی تکرار میں لطف آتا ہے۔ اس نے اس دعوت و طلب کے جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر بھیج دیا تھا :-

دنیا اگر دھند نہ جنم ز جائے خویش :

من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

یاد رکھئے ”قناعت پیشگی“ کے معنی تعطل کے نہیں ہیں، بلکہ خود دارانہ غیرت کے ہیں جو انسان کو خود اس کے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ ”رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت“ دوزخ سے بدتر ہے۔ بہر حال جو طریقے آپ نے مقصد برآری کے لئے اختیار کئے ہیں وہ ہم ایسے آبرو باختہ، خانماں برباد لوگوں کیلئے مناسب ہوں تو ہوں، لیکن آپ کے شایان شان کسی طرح نہیں ہو سکتے۔

مشہور بات ہے کہ ”دنیا کو ٹھکرائے، دنیا آپ کے قدموں پر آجائے گی“۔ اس میں بھی ترک دنیا کا درس نہیں ہے، بلکہ علوئے نفس اور استغنا کا ہے — خیر، بات میں بات نکل آئی تو یہ فضول داستان کہنی پڑی اصل مدعا تو صرف یہ کہنا تھا کہ میر صاحب کی طرف سے آپ کا سویر ظن درست نہیں۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے فی الحال باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے، لیکن اگر یہ ارادہ کبھی ہو گیا تو سب سے پہلے آستانہ گرامی پر حاضر ہوں گا، مطمئن رہئے

ہمیشہ

نیاز

فراموشگارِ من
آپ کا مجھے بھلا دینا اس قدر باعثِ ایذا نہیں، جتنا یہ کبھی کبھی یاد کر لینا۔ آپ نموس
کر س یا نہ کریں، لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بیماری کا کوئی دورہ مجھ پر پڑا ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کما تھا
اور اب پھر کتا ہوں کہ

یا تو بیگانے ہی رہے ہو جسے یا آشنا

یہ ادا کیا۔ آشنا گا ہے گئے نا آشنا

ہر چند آپ سے جو تعلق رکھتا ہوں، وہ آپ کے نا آشنا ہو جانے کے بعد بھی نہیں مٹ سکتا یعنی
گردل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

لیکن کم از کم ”امیدِ وفا“ کی خلش تو جاتی رہے گی، یہ الجھن تو باقی نہ رہے گی کہ ”کوئی میری سننے والا ہے
لیکن نہیں سنتا“

معذرت کی ضرورت نہیں، میں واقف ہوں کہ آپ کے علائق و مشاغل خطا بکھنا کیسا، سانس لینے کی بھی
مہلت نہ دیتے ہوں گے۔ ہاں، ہاں، اس لئے تو میں نے کہا کہ جب فرصت کا فقدان ہو تو محبت میں اس
ہیجان کی کیا ضرورت ہے

میں خود ساری دنیا سے کٹ کے خاموش زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھے کسی سے شکایت کا کیا منہ ہے۔
غالب، ”وفاداری پر استواری“ چاہتا ہے، میں کتا ہوں کاش آپ ”بیوفائی پر استوار ہو جائیں“
کہ اگر وہ ”اصل ایمان“ ہے تو یہ بھی ”حسنِ کافری“ کی جان ہے

نیاز

اُف، کچھ نہ پوچھے آج کیا عالم ہے۔ نظامِ رامپوری کا یہ شعر آپ نے سنا ہے؟

آج کل آپ سے باہر ہے نظام

کہیں محفل میں نہ بلوائے گا

بس بالکل یہی عالم میرا بھی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ وہاں تو ”آپ“ سے مراد صرف نظام کی
اپنی ہستی ہے، اور یہاں ”آپ“ میں، ”آپ اور میں“ ”میں اور عالم ماسوا“ سب کچھ شامل ہے!

جل جلالہ

آپ نے سنا ہو گا کہ کسی بزرگ کی کسی پر نگاہ پڑی اور کایا پلٹ گئی۔ پیر و مرید جب حجرہ کے اندر داخل ہوئے
تو دو علیحدہ علیحدہ چیز تھے، لیکن جب باہر نکلے تو سیرت بھی ایک تھی، صورت بھی ایک تھی اور لوگ حیران کہ

ان میں مرشد کون ہے اور ارادتمند کون۔ الغرض ”تو من شدی من اوشدم“ کی ایسی روایتیں بہ کثرت ملاحظہ سے گزری ہوں گی۔ لیکن اگر حق الیقین اور عین الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا ہے تو ادھر آئے اور دیکھئے کہ مجھ پر کسی کی نگاہ نے کیا کام کیا۔

آپ کہیں گے مبالغہ ہے، میں کہوں گا یہ حقیقت سے بھی کم ہے۔ پھر اس کا فیصلہ کیونکر ہو؟ اچھا آپ نہیں آتے تو اپنے ”اُن“ کو بھیج دیجئے جن کی ہر بات آپ کے لئے آیت و حدیث ہے۔ وہ تو جھوٹ نہ بولیں گے۔ اور جھوٹ بولے بھی تو آپ کیوں جھوٹ سمجھنے لگے۔ قسم ہے سر مبارک کی، اُن کے بلانے کا بہانہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعی ان کی یہاں ضرورت ہے۔ اس کے جواب میں آپ ضرورت دریافت فرمائیں گے اور خواہ مخواہ دیر ہوگی، اس لئے میں کیوں نہ ابھی ابھی صاف صاف کہ دوں کہ آجکل یہاں کا موسم ہرشکالی سخت دکھن ہو رہا ہے اور بہت جی چاہتا ہے کہ کم از کم ایک ہی وقت آپ کے یا اُن کے ساتھ لطف بادہ خواری حاصل ہو جائے پھر آپ نہیں آسکتے تو انھیں بھیجئے، وہ نہیں آسکتے تو آپ تشریف لے آئے، الغرض مدعا یہ ہے کہ آپ اور وہ دونوں آئیں اور مجھے تباہ گرد کے فوراً چلے جائیں

نیاز

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہونا ہے الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ کے مجلد کتاب صرف ۱۰ روپے میں اور غیر مجلد عمار میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۰ روپے میں اور غیر مجلد ۸ روپے میں علاوہ محصول ۸ کے ملے گی

انگلستان کے دستور پر ایک تاریخی نظر

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ تمام ممالک کے آئین و دستور میں انگریزی آئین کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، کیونکہ انگریزی دستور تیرہ سو برس کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ اور شاید ہی کوئی موجودہ نظام ایسا ہو۔ جس کا ماخذ انگریزی دستور نہ ہو۔ قریب قریب تمام ترقی یافتہ ممالک کے موجودہ نظام مبنی ہیں وزراء حکومت کی ایک عاملانہ جماعت پر اور دوائیوں پر اور بلاشبکہ شبہ اس طرح کے نظام حکومت کی ابتدا انگلستان سے ہوئی۔ یہ یورپ اور امریکہ نے اس کی عملی خوبیوں سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کی مگر انگلستان کے دستور اور مختلف ممالک کے دستور میں ایک نمایاں فرق اب تک پایا جاتا ہے کیونکہ دیگر ممالک کے آئین سیاست داں اور مدبران ملک کے دماغ کے اختراع کا نتیجہ ہیں اور انگریزی دستور ان تاثرات اور قوتوں کا نتیجہ ہے جو متواتر تیرہ سو برس تک کارفرما رہی ہیں اور برخلاف دیگر ممالک کے قوانین کے آج تک تقریباً غیر مدون ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اور ممالک کے دستور کے صحیح حالات ہم اسناد اور قوانین سے حاصل کر سکتے ہیں مگر انگریزی دستور یا انگریزی نظام آئینی کا صحیح علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگریزی معاشرت رسم و رواج اور روایات پر پورا عبور نہ ہو۔

انگلستان میں باوجود اس کے کہ تحریری اسناد کی کمی ہے اور غیر تحریر کردہ قوانین یا روایات (CONVENTION) کا بہت رواج ہے پھر بھی نظام کی شیرازہ بندی آئین کے تحت میں ہے۔ یہ دستور مشتمل ہو ان قوانین پر جو پارلیمنٹ کے خود بنائے ہوئے ہیں اور جن کو تبدیل کرنے کا بھی حق اس کو حاصل ہے۔ ان روایات کا موازنہ عدالت میں ہوتا ہے۔ اور عدالت کا فیصلہ قانون ہو جاتا ہے اسی لئے انگریزی آئین کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تجوں کا بنایا ہوا ہے۔

دستوری نظام کی تشکیل کسی ایک اصول کے تحت میں نہیں ہوئی ہے چنانچہ پارلیمنٹ نے وقت ضرورت خود اپنے بنائے ہوئے قانون میں تبدیلی کی ہے۔ لیکن روایات اس کو متزلزل ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ پروفیسر ڈالسی ٹھیک لکھتا ہے کہ باہمی مفاہمت اور روایات کبھی قانون کی پامالی کی اجازت نہیں دیتی۔ بعض حالت میں صرف انہیں

کے باعث اس امر کا قطعی فیصلہ قرار پاتا ہے کہ قانونی طاقت کا کس طرح جائز استعمال ہونا چاہئے۔ رواج کا اس قدر اثر اس امر کا اعتراف ہے کہ کسی رواج کی خلاف ورزی فی الحقیقت قانون کی خلاف ورزی ہے یا دوسرے الفاظ میں وہی قانون ہے۔ مثلاً یہ روایات ہی کا اثر ہے کہ مجلس وزراء جو اعتماد عامہ کھو بیٹھی ہو اور پھر بھی با اختیار رہنا چاہے یا عنان حکومت سے دست بردار ہو تو وہ یا تو بحری و بری افواج کو اپنے تحت میں رکھنے سے قاصر رہے گی یا محصولات کو بغیر خلاف ورزی قوانین وصول نہ کر سکے گی۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ سیاسی شطرنج، روایات کی بساط کے علاوہ کسی اور بساط پر پھیلانی جاسکے۔ یہ روایات با عزت مفاہمت اور یک جہتی کا زینہ ہیں۔ جن کی بنا پر مجالس قانون ساز اور مدبران ملک کو اختیارات دئے گئے ہیں اور جن کے خلاف وہ کبھی قدم نہیں بڑھا سکتے۔

ان روایات کی پابندی کی علت غائی یہی ہے کہ رائے عامہ کا منشا پورا ہو سکے یا بالفاظ دیگر رائے عامہ کے خلاف کچھ نہ ہو سکے۔ اسی کے تحت میں یہ اصول قائم ہوا کہ تاج بغیر وزراء کے کچھ نہیں کر سکتا نہ وزراء بغیر راکین دیوان عام کے کچھ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دیوان خاص دیوان عام کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اور آخر میں دیوان عام ماتحت ہے تمام حلقہ ہائے نیابت کا۔ اور اسی اصول کا یہ نتیجہ ہے کہ تمام غیر واضح شدہ اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کیا جاسکتا جس سے روایات کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روایات اور رسم و رواج کی پابندی اس لئے ہے کہ قانون کی حکومت اور قانونی فضیلت مستحکم ہو جائے۔ قانونی فضیلت سے مراد حسب ذیل ہیں :-

جیسا کہ ہم کسی اور مضمون بہ عنوان ”آئینی آزادی“ کے تحت میں لکھ چکے ہیں بغاوت عظیم یعنی (Great rebellion) سے قبل ہر شخص کو گورنمنٹ کے خلاف تقریر یا گورنمنٹ کے خلاف کوئی کارروائی میں لاسنے کے جرم میں گرفتار کیا جاسکتا تھا لیکن اب کسی شخص کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی جب تک کہ اس نے قانون کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کی ہو اور اس کا جرم باقاعدہ کسی عدالت میں نہ ثابت ہو چکا ہو۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ تمام ملک کے باشندے امیر و غریب چھوٹے بڑے سب کے لئے یکساں قانون ہے اور سب ملک کے معمولی قوانین اور عدالتوں کے ماتحت ہیں۔ عدالت اسٹار چیمبر کا طلسم جب سے ٹوٹا اس کے بعد سے انگلستان میں کوئی ایسی خاص عدالت نہیں رہی ہے جس میں گورنمنٹ کے مخالفین پر بیجا کارروائی عمل میں لائی جاتی ہو۔

انگریزی دستور کی تاریخ فی الحقیقت انگریز قوم کی تاریخ ہے یوں تو بہت سے محققین نے موجودہ انگریزی سیاسی اداروں کی ابتدا قدیم اہل روم کے نظام سے بتائی ہے۔ لیکن انگریزی دستور میں وہ خصوصیات نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں جو اینگلو سیکسن نس کے اندر موجود ہیں۔ تاریخ میں جس معیار سے نسل کو تسلیم کیا جاتا ہے وہ تہذیب کی خصوصیات عام خیالات و جذبات۔ مشترکہ سیاسی ادارہ جات۔ قوانین۔ ادب۔ زبان۔ مذہب و فنون لطیفہ وغیرہ

ایک مشترکہ مانتی کی روایات ہیں جو ایک قوم کے جذبات میں ہمیشہ مستقبل کے لئے روح پھونکنے کا کام کرتی ہیں۔ ان تمام باتوں میں انگریز اب تک اینگلو سیکسن ہیں

اس اعتبار سے انگریزوں کی دستوری تاریخ صحیح معنی میں ۱۷۰۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ ولیم فاتح نے انگلستان میں قدم رکھا اور نارمن لوگ انگلستان میں آکر آباد ہوئے۔ ولیم نے مغربی یورپ میں ایک اعلیٰ قسم کا استبدادی حکومت کا نمونہ پیش کیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے تحت میں ایک نظام جاگیر کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت جاگیردار بادشاہ کی اعانت کے پابند تھے۔ اس کے بعد کے جانشینوں نے نظام کو اور مرکزی بنایا اور اس کی دستوری تشکیلات کے لئے تمام ملک کے قدیم رسم و رواج و روایات کو عدالتی نظام میں شامل کر لیا۔ ان میں خاص طور پر دورہ کرنے والی عدالتیں شامل تھیں اور وہ جو ری جو مقدمہ کی سماعت کرتی تھی۔ انھیں سے قوانین عامہ بالفاظ دیگر قانون معاہدہ، (Forl) اور (Equity) کی ابتدا ہوئی جس نے شخصی حکومت کو مکمل کر دیا

بادشاہ جان کے زمانہ میں جاگیرداروں نے ایک منظم بغاوت بادشاہ کے خلاف کی اور بادشاہ کو مجبور کر کے مراعات و حقوق حاصل کئے۔ جاگیرداروں نے اس عقیدہ پر کام کرتے ہوئے کہ معاہدات کی رُو سے بادشاہ کے اختیارات بھی محدود ہیں اس امر کا اصرار کیا کہ بادشاہ ان تمام حقوق کے اعلان فرمان کی صورت میں کرے اور یہ (Great Chart) یا فرمان اعظم کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اور بادشاہ نے اس کا اقرار کیا کہ وہ ملک کے قوانین و روایات کو پامال نہ ہونے دے گا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اسی پروانہ آزادی کی تفصیلات کو بھلا دیا گیا۔ لیکن دستوری ارتقا میں یہ اصول کار فرما رہا کہ بادشاہ آئین کو قائم رکھنے پر مجبور ہے اور اگر وہ اس سے درگزر کرے تو ملک کو اسے مجبور کرنے کا حق جائز ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا باوجود بادشاہت کی موجودگی کے انگریزی آئین جمہوری آئین ہے اس کا جواب یقینی اثبات میں دیا جائے گا۔ ہم ایک دوسرے مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ بادشاہ کا وجود بحیثیت موجودہ جمہوریت کے منافی نہیں ہے اور اس عنصر کو چھوڑ کر کوئی چیز ایسی ہے جو اسے جمہوریت سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ فی الحقیقت جب کہ رائے عامہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ اس کی کابینہ سلطنت بھی بدلتی رہتی ہے تو یقیناً امریکہ کے مقابلہ میں انگلستان میں زیادہ جمہوریت ہے

اب ہم مرکزی نظام کی ایک مختصر سی تاریخ اس طرح پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ انگریزی دستور ارتقا کے مدارج طے کرنا ہوا کس طرح موجودہ شکل میں آیا (Saxons) اور (Angles) قومیں جب انگلستان کی سر زمین پر شمالی جرمنی کی سرحد پار کر کے آئیں تو انھوں نے موجودہ آبادی کو (Celt) نسل کا پایاجن کا تمدن بہت کچھ اہل روم کے تمدن سے متاثر ہو چکا تھا۔ بعض معمولی باتوں میں اہل روم کے کلیسا کا اثر بھی پایا جاتا تھا۔ مثلاً اسناد و فرمان بطور قانونی نظائر کے تسلیم کئے جاتے تھے۔ وصیت تحریر کرنے کا طریقہ

بھی انھیں کا ساتھ تھا لیکن تہذیب و دبا کا اثر طرز حکومت و قوانین پر بہت کم تھا۔ قانون وراثت بھی (Saxon) قوم کا اپنا تھا۔ (Saxon) نسل کے سامنے موت و زلیست کا سوال درپیش تھا۔ اون کے دل میں قدر تا یہ ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ اپنے تحفظ اور اپنی بقا کے لئے اون کا ایک مضبوط بادشاہ ہونا چاہئے جو اون کا تحفظ ایک حملہ آور قوم کے خلاف کر سکے۔ اس ابتدائی حالت سے مرکزی و غیر مرکزی سیاسی اداروں میں بتدریج ترقی ستلہ ۶ تک قائم رہی جب کہ نارمن قوم نے انگلستان کو فتح کر لیا۔ اون کے آنے کے بعد بادشاہ کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور مرکزی نظام نے بہت ترقی کی

اگر دستور سے ہم مراد صرف مرکزی نظام قرار دیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکثر عناصر جن سے کہ انگریزی دستور کی قطعی تشکیل ہوئی وہ نارمن قوم کے ہیں نہ کہ (Saxon) کے۔ ادارہ بادشاہی کی بھی نارمن قوم ہی نے تکمیل کی۔ نظام جاگیر بھی انھیں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ سیکسن کے زمانہ میں جو نظام جاگیری تھا وہ محض اقتصاد یا پر قائم تھا۔ مگر اس سیاسی نظام جاگیری کا جس میں رعایا پر بادشاہ کی ملکی اور فوجی خدمات اور جاگیر دار کے احکام کی پابندی بھی عائد تھی انگلستان میں ستلہ ۶ یعنی نارمن قوم کے آنے سے پہلے نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس کے ذمہ دار صرف نارمن ہی ہیں۔ اس کے ذریعہ سے نظام دو متضاد خصوصیات پر قائم ہوا یعنی ایک طرف مطلق العنان بادشاہ اور مرکزی حکومت دوسری طرف ایک قومی جاگیر داروں کی صف۔ اس زمانہ میں بادشاہ سے صرف اس قدر توقع کی جاتی تھی کہ امن و امان ملک میں قائم رکھے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوتا تو بہت اچھا بادشاہ کہلاتا تھا۔ جس طرح جاگیر دار جاگیر کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا اسی طرح بادشاہ ملک کو۔ یہی اصول نظام جاگیری کی روح رواں تھا۔ نارمنوں کے ورود کے وقت معمولی نظام و امن و امان قائم رکھنے کے لئے صرف دو سیاسی ادارے اس وقت موجود تھے۔ ایک تو (Sheriff) کا عہدہ تھا جس کے ذریعہ سے مرکزی حکومت مفصلات میں کار فرما تھی دوسری مرکزی نظام کی تربیت کے لئے مجالس قومی کی شکل میں ایک جماعت تھی جس کا دوسرا نام کونسل اعظم تھا۔ اس کو (Curia Regis) بھی کہتے ہیں۔ (Sheriff) کے عہدہ کی ابتدا کہاں سے اور کب سے ہوئی اس کی تحقیق ذرا دشوار ہے لیکن غالباً اقتصادی احکام کے لئے یا بہ حیثیت شاہی زمینوں کے ایک کارندے کے وہ اپنے فرائض مفصلات میں انجام دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ضرورت کے اعتبار سے

(Sheriff) عاملانہ اور عادلانہ فرائض بھی انجام دینے لگا۔ نارمن قوم جو کہ فرانس میں قیام پذیر ہوئی اس میں بھی اس قسم کا ایک عہدہ دار ہوتا تھا جو (Viscount) کہلاتا تھا۔ انگریزی (Sheriff)

کو اس عہدہ سے ملتا جلتا پاکر نارمن لوگوں نے اس عہدہ کو قائم رکھا

ابتداً (Curia Regis) یا کونسل اعظم میں ملک کے اور کلیسا کے بڑے بڑے عہدہ داران

اور بادشاہ کے خاص مصاحبین و ملازمین شامل تھے۔ لیکن نارمنوں نے اسی کونسل میں ایک قطعی جاگیری اصول نیابت قائم کیا۔ اسی کونسل کے اندر ایک چھوٹی سی کونسل بن گئی تھی جس کے ارکان وہ افراد ہوتے تھے جو سلطان کا قرب حاصل کئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کونسل میں کوئی امتیازی حیثیت یا فرق قائم کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ جو کام بڑی کونسل انجام دیتی تھی وہ چھوٹی کونسل بھی دے سکتی تھی۔ حقیقت میں تمام نظامی امور کی دیکھ بھال یہ چھوٹی کونسل ہی کرتی تھی

یہی کونسل حکومت کی مشین کا وہ مرکز تھا جس کے گرد تمام نظام گھومتا تھا۔ یہ تمام نظامی امور اور تمام شعبہ جات پر بغیر کسی ادارہ جاتی تقسیم کے حاوی تھی۔ یہی سب سے بڑی مجلس مقننہ تھی۔ سب سے بڑی عدالت عالیہ بھی یہی تھی جس میں کہ بڑے بڑے مقدمہ جات اور تنازعات طے پاتے تھے۔ تمام عاملانہ شعبہ جات بھی اسی کے تحت میں تھے اور تمام ملازمین و عہدہ داران اس کے ماتحت قرار دئے گئے تھے

رفتہ رفتہ مالیات کے متعلق اور محصولات کے قائم کرنے اور وصولیابی کے متعلق اسی کونسل کے مقررہ مشن ہونے لگے۔ یہ شعبہ جاتی تقسیم کی ابتدا ہے۔ جب نظام میں شعبہ مالیات ایک علیحدہ حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ سن ۱۱۷۰ء کے بعد اسی چھوٹی کونسل نے ہمیشہ کے لئے محصولات و لگان کے متعلق انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب یہ کونسل اس خاص موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے جمع ہوتی تو یہ خاص سشن (Exchequer) کے نام سے موسوم ہوتا۔ نارمن فتح کے بعد ایک صدی کی نمایاں ادارہ جاتی ترقی بھی تھی کہ (Exchequer) یا محصولات کی الگ ایک حیثیت قائم ہو گئی

دوسری زبردست قوت جو برسوں سے پنہاں طور پر کام کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ کلیسا کی نظام اور تمام نظام عامہ سے بالکل آزاد تھا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا سب سے زیادہ دو زبردست عنصر بادشاہ اور جاگیردار تھے۔ بادشاہ نے جاگیرداروں پر بہت فوقیت حاصل کر لی۔ اس میں جو عناصر اس کے معین ہوئے وہ یہ تھے کہ بادشاہ تمام افواج اور محصولات کا مالک تھا جس سے اس کی بڑی شان و شوکت تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال کہ بادشاہ نائب خدا ہے بہت کچھ اس کی قوت کے دو بالا کرنے میں معین ہوا۔ یہ عقیدہ تقریباً ہر قوم کے ابتدائی تمدن میں رہا ہے

ولیم فاتح کے لڑاکے ولیم رؤفس نے ان مواقع کا جو اس کو نصیب ہوئے بہت بُرا استعمال کیا۔ اس کے بعد اور سلاطین نے بھی استبدادی حکومت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیرداروں نے مسلح بغاوتیں کیں اور بادشاہ سے اپنے حقوق تحریر کی صورت میں لکھوائے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے

۱۱۷۰ء میں بادشاہ ہنری کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ عوام کے دلوں میں تو قانون کی عظمت بہت کچھ موجود

ہے لیکن افسران سرکار اور مرکزی حکومت کے ملازمین میں جو بے ضابطہ کارروائیاں اور بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں ان کا انسداد کس طرح ہو؟ اس کے لئے وہی چھوٹی کونسل جو نظامی امور کی ذمہ دار تھی اور عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھی مفصلیات کا دورہ کرنے لگی اور ہر ضلع اور دیہات میں جا کر افسران سرکار کے خلاف گواہی سننے لگی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان اطلاعات کو فراہم کرتی تھی جن کی رو سے مصلحتات اور لگان شاہی قائم ہوتا تھا

اسی کونسل کے دورے اور عدالتی کارروائیاں انگریزی نظام میں عدالتی اداروں کے ارتقاء کی بہت کچھ ذمہ دار ہیں۔ اس کی امداد سے نظام اور زیادہ مرکزی ہو گیا کیونکہ اس سے مرکزی نظام کے کارکنان کو عوام الناس سے اتصال کا موقع مل گیا۔ یہاں پر انگریزی دستور کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آتی ہے جس میں کہ بادشاہ کی نگرانی نظام کے تمام شعبہ جات پر حاوی تھی

جب ہنری دوم تخت نشین ہوا تو اس نے اصلاحات کی طرف قدم رکھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ اس نے یہ محسوس کی کہ نظام کلیسائی کے عمدہ دار اور متعلقین اس کی عدالتوں سے بالاتر ہیں۔ زمانہ (Samson) میں ایسی کوئی تفریق موجود نہ تھی۔ پادری اور عام لوگ سب ایک ہی عدالت کے ماتحت تھے لیکن چونکہ کلیسا کی قوت اس وقت بہت کافی زبردست ہو چکی تھی اس لئے ہنری دوم مکمل طور سے اس نقص کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور فوجداری کے بھی چند حقوق باوجود اس کے کہ وہ شاہی عدالتوں کے تھے کلیسائی عدالتوں نے غصب کر لئے۔ حالانکہ وہ تمام مراعات جو کلیسا کو بادشاہ (Stephen) کے زمانہ میں حاصل ہوئی تھیں وہ نہ قائم رہ سکیں لیکن کلیسا کی شان و شوکت و اقتدار میں بہت زبردست اضافہ ہو گیا۔ تیرہویں صدی کا نظام کلیسائی بالکل آزداد اور اس قدر قوی سمجھا جاسکتا ہے جتنا کہ بادشاہ ملک کا۔ کلیسا کی مدد کے لئے سب سے بڑی قوت پوپ کی بھی تھی جو تمام یورپ میں اقتدار دنیاوی اور روحانی قوت کا منظر بنا ہوا تھا

جب جان کے جابرانہ طرز و انداز سے تنگ آکر جاگیرداروں (Barons) نے بغاوت کی تو تمام حقوق کا فرمان یا (Charter) حاصل ہوا۔ اور بادشاہت کو محدود کرنے کی پہلی کڑی یہی تھی

یہی فرمان اعظم انگریزی سیاسی اداروں کی حقیقی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ گویہ فرمان صرف نظام جاگیری کے استحکام کا ایک معاہدہ ہے اور گویا ظاہر اس فرمان میں پارلیمنٹ کا وجود ٹیکس میں عوام کی رضامندی۔ جوری کے سامنے مقدمہ کی سماعت اور (Habeas Corpus Act) کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سب اسی فرمان کا فیض ہے اور کسی نہ کسی طرح اسی کا نتیجہ ہے۔ بادشاہ کے اختیارات کی حدود بندی نے ملک کو حریت کی شاہراہ پر لگا دیا۔ اور پارلیمنٹ صحیح معنی میں پیدا ہو گئی۔ جوری کے اصول کی بھی تقویم ہو گئی۔ اور ملک میں قانون کا تسلط ہو گیا۔ بادشاہ پر قانون کی حرمت بھی لازم ہو گئی۔ اور یہ طے ہو گیا کہ جو بادشاہ قانون کو پامال کرنے کی

جرات کرے وہ تخت سے اوتار دیا جائے گا۔ چنانچہ فرمانِ اعظم کے حاصل ہونے کے بعد جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے ان سب کو تاج پوشی کے وقت فرمان کی تکمیل کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی تھوڑی مراعات اور حاصل ہوتی گئیں یا یوں کہئے کہ بادشاہ کے اختیارات اور کم ہو گئے۔ اور بادشاہت کی مخالفت قوتیں زور پکڑتی گئیں۔ اور عوام میں ایک اجتماعی احساس پیدا ہونے لگا حالانکہ اس وقت کوئی ایسا قومی جذبہ موجود نہ تھا جس کو موجودہ نیشنلزم سے تعبیر کیا جاسکتا۔ رفتہ رفتہ اختیارات کا احساس بڑھتا گیا۔ اور ہوتے ہوتے بادشاہ قطعاً ایک آئینی بادشاہ ہو گیا جس کا خاکہ ہم نے علیحدہ مضمون میں دیا ہے

تھوڑے زمانہ کے لئے اس ضمن میں خاص طور پر ایک معاہدہ کا ذکر ضروری ہے۔ یہ معاہدہ (provisions of Oxford) کے نام سے مشہور ہے

اس کی رُو سے عائدین ملک (Barons) نے یہ ایک اور حق حاصل کر لیا کہ ملک کا عدالتی نظام بادشاہ سے الگ کر کے اسی کونسل کے اراکین کے سپرد کر دیا۔ اس فرمان کی رُو سے بادشاہ کی قوت محکمہ عدل میں قریب قریب معطل ہو گئی اور کمیشن اور تحقیقاتی ادارے جو دورہ کرتے تھے وہ اس کونسل کے ماتحت ہو گئے اس کے بعد ایک سو سال کے اندر (Impeachment) کے طریقہ کا ارتقاء ہوا جس کی وجہ سے وزراء کی کونسل کی ذمہ داری بھی تسلیم کی جانے لگی۔ بنیادی طور پر فرمانِ اکسفورڈ ایک پیش خیمہ اس اصول کے قائم کرنے کا تھا کہ عوام کی حکومت کا نظام عوام ہی کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ اور باشندگان ملک کی خود اختیاری یا (Sovereignty of people) کا مسئلہ جو سترہویں صدی میں طے پایا حقیقتاً تیرہویں صدی کی کاوشوں کا ایک مکمل نتیجہ ہے

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ پارلیمنٹ صحیح معنوں میں کیسے اور کب ظور میں آئی۔ ہنری سوم کے دور حکومت کے اختتام سے کچھ قبل ہی پارلیمنٹ کا یہ کام ہو گیا کہ وہ بادشاہت کے خلاف ایک ایسی جماعت بنی رہے جو ملک کے دستور کی حمایت کرے۔ پارلیمنٹ کو جیسا اوپر کہا گیا کونسلِ اعظم ہی سے بنی ہے۔ مگر پہلے کونسلِ اعظم نظامِ جاگیر کی ایک مجلس سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اب ایک نمایاں فرق یہ ہونے لگا کہ برخلاف پہلے اصول کے اب پارلیمنٹ میں تاجروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے بھی نمائندے آنے لگے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے نمائندے بھی اس کے ممبر ہو گئے۔ اس وقت پارلیمنٹ کے رکن صرف یہ خدمات انجام دیتے تھے کہ مفصلات کے لوگوں کے جذبات و آرا کی ترجمانی کرتے تھے۔ گورنمنٹ کو اپنی پالیسی قائم کرنے کے لئے جو رائے عامہ کے متعلق اطلاعات فراہم کرنی پڑتی تھیں وہ ان اراکین کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرتی تھی

۱۶۸۹ء میں ایڈورڈ اول نے ماڈل پارلیمنٹ قائم کی جس میں ملک کے تمام طبقہ جات کی نمائندگی کا اصول تسلیم کیا گیا ساتھ ساتھ اس میں کلیسا کے عہدہ داران بھی شامل ہوئے مگر وہ بعد میں اس سے الگ ہو گئے رفتہ رفتہ یہ بڑی جماعت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ کونسل اعظم میں صرف جاگیردار وغیرہ رہ گئے برخلاف اس کے تاجر پیشہ اور درمیانی طبقہ کے نمائندے دیوان عام کے رکن بن گئے

یہ دو خاندان سے قبل جو خانہ جنگیاں جاری رہی ہیں ان سے ملک کو بے حد نقصان پہونچا۔ تجارت صنعت و حرفت اور سب کا دوبار زندگی بند ہو گئے۔ لہذا ملک بھر میں یہ عام ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ایک مضبوط بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہو جو مدبران ملک کی خود غرضی کے ہتھکنڈوں سے بچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یوڈر خاندان کے... بادشاہوں نے بہ رضا و رغبت اپنے ملک کے لیے نئے سرے سے استبدادی اور شخصی حکومت کا دور جاری کیا۔ اس عہد میں پارلیمنٹ بادشاہ کی بہت مطیع تھی اور بادشاہ نے جو چاہا وہ پارلیمنٹ سے پاس کروالیا۔ ان کے بعد خاندان اسٹورٹ آیا اسی زمانہ میں تحریک (Puritan) بہت زور پکڑ گئی تھی۔ (Puritan) ممبران پارلیمنٹ میں بہت کثرت سے آئے لگے۔ اور بادشاہ کے شخصی حقوق کی نہایت پُر زور مخالفت ہونے لگی جیمس اول نے تو لے دے کے اپنی حکومت بخیریت گزار دی مگر اس کا لڑکا چارلس اول بہت ضدی تھا۔ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ پارلیمنٹ کو نیچا دکھا کر چھوڑے۔ وہ اپنے آسمانی حقوق کی ڈینگ مارنے لگا۔ فطرتاً پارلیمنٹ نے اور مخالفت کی اس نے گیارہ سال تک پارلیمنٹ کو معطل رکھا اور قطعاً مدعو نہ کیا۔ اس وقت اُس نے اپنے وزیروں کی مدد سے حکومت کی۔ مذہبی امور (Land) کے تحت میں ہو گئے اور سلطنت کا سب کام (Strafford) کیا کرتا تھا۔ پارلیمنٹ نے محصول کا وصول کرنا۔ اور دنیا جس پر اس کی رضامندی کی مہر ثبت نہ تھی نا جائز قرار دیا لہذا بہت سے لوگوں نے محصولات دینے سے گریز کیا۔ مقدمے عدالت میں ہوئے۔ مگر چونکہ عموماً جج بھی خوشامدی تھے انھوں نے فیصلہ بادشاہ کے حق میں کیا۔ بہر حال یہ کشمکش جاری تھی ہی کہ ادھر آرلینڈ کے حالات ناقابل اطمینان ہو گئے اور ادھر اسکاٹ لینڈ لڑائی۔ پر آمادہ ہو گیا۔ بادشاہ کے خزانہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ تب مجبوراً اُس نے پارلیمنٹ کو مدعو کیا۔ پارلیمنٹ نے قبل اس کے کہ کسی ٹیکس کی منظوری دے پہلے اپنے تمام حقوق بادشاہ سے تسلیم کر لئے جو (Declaration of Rights) (اعلان حقوق) کے نام سے مشہور ہیں

- (۱) اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ بغیر پارلیمنٹ کی رضامندی کے بادشاہ کو محصولات قائم کرنے کا حق نہیں ہے
 - (۲) پارلیمنٹ کے ممبران کو پارلیمنٹ کے خلاف تقریر کرنے میں گرفتار نہ کئے جائیں گے
- اب پارلیمنٹ نے چاہا کہ چارلس اول کے وزرائے سے مواخذہ طلب کرے۔ چارلس نے اس غصہ میں چاہا کہ پارلیمنٹ

کو برخاست کر دے مگر اپنے دل پر جبر کر کے اپنے رفیق وزیر (Strafford) کے قتل نامہ پر دستخط کر دے۔ پارلیمنٹ اور بادشاہ کے درمیان میں خلیج اور وسیع ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۶۴۲ء میں سول وار شروع ہو گئی بہت کچھ نشیب و فراز کے بعد بادشاہ کو کرامویل کے ہاتھوں شکست ہوئی اور چارلس کو موت برداشت کرنی پڑی۔ کرامویل نے رفتہ رفتہ تخت پر قبضہ کر لیا اور دستور میں نئی نئی تبدیلیاں کرنی چاہیں اور نئے نئے سیاسی ادارہ جات قائم کئے مگر اس کے انتقال کے ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے۔ خاندان اسٹوارٹ کے افراد دوبارہ تخت نشین ہوئے لیکن محدود اختیارات کے ساتھ۔ ان کی نسل کا خاتمہ ہونے پر ہالینڈ کے ولیم کو جو شاہزادی میری کا خاوند تھا مدعو کیا گیا اور دونوں کو مشترکہ بادشاہ بنادیا گیا۔ اب پارلیمنٹ نے اپنے حقوق مفصل طور سے تسلیم کرائے اور خارجی امور کو چھوڑتے ہوئے اندرونی انتظام پارلیمنٹ نے اپنے ہاتھ میں منتقل کر لئے اسی زمانہ میں وزیر اہل پارٹی بندی شروع ہو گئی جن کا مفصل ذکر علیحدہ مضمون میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد ہنری وریٹ کی ابتدا سے وزیر اعظم کے عہدہ کا ارتقار شروع ہوا ہے۔ جس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ غرض صدیوں کی جدوجہد کے بعد آئین کی موجودہ شکل تیار ہوئی اور اس نے استقامت حاصل کی

جعفری

مجموعہ دستفرو و جواب

ایکہ ارسفحات کا گنجینہ، علم و ادب طیار ہورہا ہے اور اعلان کیا گیا تھا کہ عہد جس کی قیمت پیشگی آجائے گی اس کو یہ مجموعہ اسی قیمت میں دیدیا جائے گا۔ چونکہ اعلان کی میعاد ختم ہو گئی ہے اس لئے اب کوئی صاحب عہد بھیج کر اپنا نام درج نہ کرائیں طیارہ کے بعد جو قیمت مقرر ہوگی، اس سے ایک روپیہ کم پر حسب معمول خریداران نگار کی خدمت میں یہ مجموعہ پیش کیا جائے گا کم از کم پانچ روپیہ قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے

نیچر نگار لکھنؤ

بھیا کی چڑیاں

(۱)

تاریک اور سنسان جنگل میں جھونپڑی کی تاریک فضا کو نمایاں کرنے کے لئے ایک چراغ کافی ہے ! اور حیات انسانی کو مدارِ کمال تک پہنچا دینے کے لئے ذرا سی معمولی بات چودل کو لگ جائے
ایک ذرا سی "نظر" ایک چھوٹی سی "بات" ! آہ ! ایک تبسم ! دنیا لی انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ روحانی قوت بھری ہے جو انسانی جذبات میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے اور روح کو بیدار

(۲)

آج رامو کے دل کو کوئی دیکھ سکتا تو سمجھتا کہ اس کا کیا عالم تھا۔ اور اس کی روح کس درجہ مسرور تھی۔ رامو پھیری لگانے نکلا تھا کیونکہ مٹی کی زمین پر موم کے کھلونے بنانا اور بیچنا اس کا روز کا مشغلہ تھا
وہ موم کی چڑیاں بناتا اس میں لال پیلا ہر رنگ بھرتا اور انھیں ایک ڈورے کے سہارے اپنی لکڑی سے جھلاتا
ہوا روز صبح کو نکل جاتا اور شام ہوتے ہوتے کچھ نہ کچھ کما لاتا۔ جس وقت وہ راستے سے گزرتا اور اپنی رسیلی آواز سے کہتا۔
"للا کی چڑیاں ہیں بھیا کی چڑیاں۔ جن کے ہوویں گے کھیلنا وہی لیویں گے چڑیا
"واہ واہ ری چڑیا"

— تو بچے بے قرار ہو کر دوڑ پڑتے اور چاروں طرف سے اُسے گھیر لیتے

چلتے چلتے رامو نے آواز لگائی۔ اس کی دلکش رسیلی آواز گاؤں کے گھروں میں گونج اٹھی بچے اچھل پڑے ! کتنے ہی گھروں میں اماں "اوں" "اوں" "رونا، چلنا مار پیٹ اور دھماجو کڑی بچ گئی۔ رامو کہتا جا رہا تھا "جس کے ہوویں گے کھیلنا وہی لیویں گے چڑیا۔ واہ واہ ری چڑیا"

یہ آواز حد درجہ دردناک تھی ان کے لئے جن کے گھر بے نور تھے جو صاحب اولاد نہ تھے یہ دل تڑپا دینے والی صدا تھی ان کے لئے جسکی گودی بچوں سے خالی ہو چکی تھی۔ بتا بچے والیوں نے ایک گہری سانس بھری
رامو چلا جا رہا تھا خریدنے والے اسے خود بلاتے، بھاؤ کرتے۔ لیتے یا اسے لوٹا دیتے۔ کتنے ہی بچوں نے اسے بلایا

کتوں ہی نے اس سے بھاؤ کیا۔

وہ ایک چڑیا دو پیسہ میں بیچتا تھا اور اس سے کم میں وہ کسی کو نہ دیتا تھا۔ جو لے سکتے وہ لیتے اور جو نہ لے سکتے وہ جی مسوس کر رہ جاتے۔

یکایک کسی نے رامو کو پکارا۔ ”ارے او چڑیا والے۔“ رامو لوٹ پڑا۔

دروازے پر ایک بیوہ کھڑی تھی اور پاس ہی ایک پانچ سال کی بچی ماں کے سہارے سے کھڑی ہوئی تھی۔ رامو کے پہنچتے ہی وہ سننے لگی، اس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا اس نے کہا ”نانی وہی وہ ادھر والی لال لال سی!“

”اچھا ٹھہرو!“ کہتے ہوئے بیوہ ضعیفہ نے رامو سے پوچھا!

”بول بھیا کے کے پیسے یہ چڑیاں دیں!“

”دو دو پیسے مائی!“ رامو بولا۔

”ٹھیک بتاؤ تو لے لوں ایک اس بچی کے لئے!“

بچی کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کاش چڑیا والا مان جائے۔ اُمید و یاس، یقین و شک۔ خوشی اور رنج کی لہریں اس کے چہرے پر تیزی سے آ جا رہی تھیں۔ وہ منتظر تھی اور رامو کی طرف تجسس نظر میں جمائے منتظر تھی کہ دیکھے وہ کیا کہنے والا ہے! یہ اس کے لئے انتہائی دلچسپ انتظار تھا اور گویا اس کی قسمت کا فیصلہ۔ اس کی نظریں رامو کے ہونٹوں پر جمی تھیں۔

رامو نے کہا ”نہیں مائی کم زیادہ نہ ہوگا دو دو پیسے بھی کو دیتا ہوں“

بیوہ بولی ”اچھا تو تمہاری مرضی دو دو پیسے تو بہت ہیں“

(۳)

رامو لوٹا، لڑکی کا چہرہ اتر گیا۔ وہ نڈھال ہو گئی۔ اس کی روح چلا رہی تھی ”مائی دو دو پیسے کیا بہت ہیں“

”رامو کیا تجھے ایک پیسہ کم کرنا مشکل تھا“ اس کے جذبات میں پہچان برپا تھا، مصومیت کے جذبات اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں سے نمایاں تھے، آخر کار وہ مایوس ہو کر مضطرب ہو گئی۔

ضعیفہ نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دی اور کہا۔ ”جائے دے مرا بیٹا مرا لال جائے دے، دوسرا کوئی آوے گا تو تجھے بہت اچھی چڑیا لے دوں گی!“

اس بے معنی ڈھارس کو بچی نے سنا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لئے ہوئے گھر کے اندر چلی گئی۔

(۴)

آج خدا جانے کیا بات تھی کہ رامو کے قدم آگے نہ اٹھتے تھے۔ اور وہ ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کوئی گنگا کے کنارے

تک جا کر بغیر نہائے لوٹ آئے

گو اس نے اس خیال کو بھلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن نہ معلوم کیوں وہ خود اپنے آپ کو بھولنے لگا اس کی حالت گرتی جا رہی تھی وہ خود کو سنبھالنا چاہتا تھا ادھر ادھر کی باتیں سوچتا طرح طرح کے جی بھلانے کے بہانے پیدا کرتا لیکن اس کے دماغ سے وہ معصوم نظریں دور نہ ہوئیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اپنی پُر خم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے آج رامو ایک گہری ندی میں ڈوب رہا تھا، اس کی ایسی حالت کبھی نہ ہوئی تھی وہ خود بخود کہہ رہا تھا کہ ”نہیں میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں اس بے چاری بچی کے نازک دل پر میں ایک سخت پتھر مار کر چلا آیا ہوں اس کا چہرہ کیسا اتر گیا تھا اور اس کی آنکھ اُٹ! کس طرح دیکھ رہی تھی..... نہیں نہیں..... یہ ٹھیک نہیں۔ روزگار کے معنی یہ تھوڑے ہی ہیں کہ میں اس طرح سخت دل ہو جاؤں ایسا بیدار دین جاؤں ارے رام رام! کیا ہوتا اگر میں ایک ہی پیسے میں اسے دیدیتا..... کوئی گھائے کا پہاڑ تو نہ ٹوٹ پڑتا نہ سہی ایک وقت تمباکو نہ پیتا نہ سہی۔ خیر ساگ ہی روٹی کھا لیتا..... بچوں کا دل توڑنا رام رام بھگوان کی مورت توڑنا ہے جاؤں دے آؤں۔ مگر اب تو اتنی دُور چلا آیا۔ ہوگا بھی۔ دنیا کے یہی کارخانے ہیں۔ روزگار میں رحم سے کام نہیں چلتا۔ کوئی نہس لے سکتا تو نہ لے“

(۵۱)

اس خیال نے رامو کی روح کو جھنجھوڑ دیا وہ چونک پڑا اس نے گھبرا کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور دل کو مضبوط کر کے پھر وہی آواز لگانے لگا لیکن اب بھی اسے معلوم ہو رہا تھا کہ دل کے اندر کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ اور اس کے تمام کاروبار نہ دلائل پست ہوتے جا رہے ہیں، اس کی حالت بدل رہی تھی اور وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت پار رہا تھا جو اب سے پہلے کبھی اس پر طاری نہ ہوئی تھی

رامو نے دیکھا کہ خاموش رہنے سے جذبات کا طوفان اور امنڈتا چلا آ رہا ہے اور جس چیز کو وہ دبانا چاہتا ہے، زیادہ ابھرتی جاتی ہے اس لئے اس نے ہمت کر کے پھر آواز لگائی ”للا کی چڑیاں.....“ اُس کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔ الفاظ اس کے گلے میں پھندا بنے جا رہے تھے۔ اس کا جی بولنے کو چاہتا ہی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ بغیر بولے ہی اس کی چڑیاں بک جائیں۔ تو اچھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہے

آخر کار رامو لوٹ پڑا۔ اُس نے سوچا کہ بچوں کے خون سے سیلج سیلج کر وہ اپنا باغ نہیں لگانا چاہتا۔ ان کے دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا محل اٹھانا اسے پسند نہیں۔ اُسی دروازے پر پہنچ کر اس نے پکارا مائی۔ مائی!

لے لو چڑیا؟

گھر کے اندر آواز پہونچی تو بیوہ نے کہا کون ہے!

بچی کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ دوڑ کر باہر گئی پھر دوڑ کر اندر آئی "ارے نانی وہی وہی چڑیا والا ہے۔ چل چل

جلدی چل"

وہ ضعیفہ کی انگلی تھام کر کھینچ لے چلی

"لے لو مائی پیسے ہی پیسے لے لو"

بچی نے جھٹ بڑھ کر ایک لال لال سی چڑیا لے لی۔ کبھی وہ چڑیا کو دیکھتی، کبھی اپنی نانی کی طرف اور کبھی سوداگر کو۔

اس کا دل مسرت سے لبریز تھا

(۶)

"رامو چڑیاں پیسے ہی پیسے کو دے رہا تھا" یہ بات پھیلتے دیر نہ لگی اس کا سب مال دیکھتے ہی دیکھتے بک گیا!

گھر پہونچ کر رامو نے دیکھا کہ نفع تو درکنار لاگت بھی نہیں آئی اور دو آنے کا گھٹا ہمارا محنت الگ رہی۔ لیکن اس کا دل مسرت سے لبریز تھا اس کی روح بشاش تھی مسکراتے ہوئے پیسوں کی طرف دیکھ کر وہ کہہ اٹھا۔ رامو! تمہارے ایسے خود بکنے والوں سے روزگار نہ ہوگا۔ اس کے لئے لکڑی کا دل چاہیے اتنے ہی میں اس کا چھوٹا بالک باہر سے دوڑتا ہوا آکر لپٹ گیا۔ بابو گودی..... رامو نے اس کا منہ چوم لیا۔ آج تو بڑا اچھا لگتا ہے میرا لالا!" رامو نے اسے محبت

بھری آواز میں کہا

بالک گودی میں اور سمٹ گیا اور رامو نے اسے پھر چوم کر لپٹا لیا

بچے کو پیار کر کے جتنی خوشی اسے آج مل رہی تھی ایسی مسرت اسے کبھی نہ نصیب ہوئی تھی

عبدالجلیل (سید سرائوی)

(ماخوذ از ہندی)

دو ادبی شاہکار

شوپنہار۔ فلسفہ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ پیر (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق۔ مجلد مع رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت پیر (علاوہ محصول)

نیچر نگار لکھنؤ

یاد رفتگان

(انتخاب کلام میرزا تقی ہوس)

عثمانیہ لائبریری حیدرآباد کے ایک قدیم نسخہ سے

نیاد

گھبرا کے یہاں آئے تھے ہم ملکِ عدم سے
یاں بھی نہ لگا جی ہمیں کیسا خفقاں تھا
جانا مجھے سب نے پہ کسی نے بھی نہ دیکھا
میں گلشنِ بہتی میں نسیم گزراں تھا
افسوس کیا دیکھ کے کل ہم نے ہوس کو
کس سوچ میں انگشتِ تحیر بے ہاں تھا

آچکا تھا صاف میرے ساتھ بیجا ب
کچھ یونہی اک شرم کا پردہ ساحل ہو گیا
ای ہوسِ معشوق سے کچھ خون کا دعویٰ نہیں
تو تو بے مائے موابے تیغ گھائل ہو گیا

شغلِ شبِ تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا
دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا
ارمان ہے پیری میں رو رو کے بصدِ حشر
لڑکوں سے جوانی کا قصہ کہیں ہم اپنا

عاشق تو تھا ہوس کو دیوانہ کب ہوا
لو اٹھ گیا حجاب بڑا ہی غضب ہوا

تم نے ظاہر میں گلے لگنے کا انکار کیا
خواب میں ہم نے تمہیں دیر تلک پیار کیا

نشہ تک تو رہا پردہ تمہیں اب ہم کو بتلا دو
خدا کے واسطے جو وقت ہووے بے حجابی کا
تری تصویر سے نسبت نہیں کچھ حسنِ یوسف کو
یہاں تو لاکھ پردوں میں ہر عالم بے نقابی کا

غم و رنج ہستی بسر ہو چکا چلو اب وطن کو سفر ہو چکا
 کیا ہم کو حیرت نے تصویر دہم ترا دو راے چشم تر ہو چکا
 کسائی پر اپنی رُلانے تھیں یہ قصہ بھی یاں خنجر ہو چکا
 فقیروں کا ماداؤ مسکن کہاں جہاں تھک گئے بیٹھے وہ گھر ہو چکا
 گو ہو بس یارانِ فتنہ کا بہت ماتم کیا حق صحبت یاد کر جو کچھ کیا سو کم کیا
 شوق دید گل کہاں اور عالم پیری کس قصدِ سیر باغ ہم نے ہاے بے موسم کیا

اپنے ہاتھوں سے ہوس آپ ہوئے تم بدنام سب کچھ آیا پہ دل اپنا نہ تھیں تھام آیا

ہنکا کہ کفر و دیں کا کوئی جائے سیر تھا میں واں گیا جہاں نہ حرم تھا نہ دیر تھا
 کیا جانے دل ہی دل میں ہر دم زبانِ یار پہ یادش بخیر تھا ہر دم زبانِ یار پہ یادش بخیر تھا

وصل مت ڈھونڈھ ہوس تیری تو یہ حالت دیکھنا چھپ کے اسے تو بھی ہر اسان ہونا

دیکھ منے گل کو گلشن میں لٹا روئے ہوس آگیا کیا جی میں بیٹھے بیٹھے تجھ کو کیا ہوا

مرا پہونچا آخری وقت جب مجھے دیکھنے کو وہ آئے تب لگے کہنے اس کو یہ کیا ہوا کہ یہ کل ملک تو بحال تھا
 وہی دن جنوں کے بھلے تھے کچھ کہ مقامِ دشت میں مرا نہ کسی کی تھی مجھے کچھ خبر نہ کسو کو میرا خیال تھا

ہم سے دارِ فتنہ الفت ہیں بہت کم پیدا ہاتھ سے لکھو نہ ہمیں ہوں گے نہ پھر ہم پیدا

آئے تھے مشتاق گل مہلت نہ پائی دید کی ورنہ اس گلشن میں آنے سے ہمیں کیا کام تھا
 اس کی دولت چین سے سویا ہوں احسان گم دم کی آمد شد سے میں تو سخت بے آرام تھا

اگرچہ ہجر کا ڈر وصل یار میں بھی تھا یہ کچھ قرار دل بقرار میں بھی تھا

رواں ہیں اشک کے جس طرح بہ جوش و خروش یہی سماں کبھی ابر بہار میں بھی تھا :
 گزشتگان زمانہ کا تم نہ وصف کرو یہی غم و الم اس روزگار میں بھی تھا
 ہوس کا دل ترے جانے سے اب ہر منزل غم کبھی خوشی کا گزر اس دیار میں بھی تھا

بلبل نے کڑھایا نہ غم گل نے رلایا ہم کو تو فقط اس کے تغافل نے رلایا

جس سے گل خون میں ڈوبا قفس مرغِ ابر تو نے پھر آج وہی زمزمہ بنیاد کیا

گل جو وہ گلرو برزدہ دامن ناز سے گزرا انگلشن میں اڑ گئی رنگ گل کی نزاکت خوب جو میں نے دھیان کیا
 برق نہکے جانسوزِ عالم خیرِ ابر و تیر مرثہ : قتل کو اک بیکس کے صاحب اتنا کیوں سامان کیا
 وصل میں ڈر ہے ان کا ہر دم ہجر میں روتے رہتے ہیں ہم کو تو بیتابی دل نے آہ بہت جسران کیا
 آوے گرتوان کے گھر تو کیا یہ تیرے نذر کریں ایک ہوس دل رکھتے تھے سو آگے ہی قربان کیا

مجھ کو کیا اگلے زمانہ کی خبر سچ تو یہ ہے کہ ترے عہد میں تجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا

یہی آن تھی سب کی کما سو کہا، سبھی کرتے تھے وعدہ کو اپنے وفا وہ چلن جو قدیم زمانہ میں تھا ترے عہد میں عہد شکن نہ رہا
 کہا سلی نے میں نے سنا ہے یہی دم گرم سے قیس کے آگ لگی وہاں جاتے تھے دو گھڑی لگتا تھا جی ہے غضب کہ وہ نجد کا بنہا

گریہ نے مرے آخر طوفان کیا برپا آنسو کا ہر اک قطرہ دلخوں کن ہم نکلا
 گوجان مری جلے زہار نہ آؤں گا کوچہ سے ترے میں تو اب کھائے قسم نکلا

جی اس کے در سو اکبیں لگتا نہیں زرا فرصت بے ناتوانی تو جاویں ہیں زرا
 رویا میں ساری عمر وے اس نے ای ہوس رکھی نہ چشم تر پہ مری آستیں زرا

ترے ڈر سے میں آہ کا ضبط کیا لے گریہ کا ضبط تو ہونہر کا بے چپکے ہی چپکے نت آنسو مرے پہ میں کھول کے دل کبھی نہ رکھا

حیراں ہوں کہوں کیا میں عجب حال ہر جی کا کچھ پوچھو نہ باعث مری افسردہ دلی کا
اتنا نہیں کوئی کہ اُسے جا کے سادے بیٹھا ہے سر رہ کوئی دارفتہ کسی کا

کوئی شب میں غم ہجر سے گریاں نہ رہا کس دن آنکھوں پہ مرے گوشہ داناں رہا

دلوے جب عشق کے تھے اور جنوں کا جوش تھا گہ میں کچھ کہتا تھا، گہ دو دو پہر خاموش تھا
زور کیفیت تھی بزم میکشاں میں شب ہوس ایک کالغزش کے باعث ایک، تھامے دوش تھا

بھولتا اب تک نہیں جی سے وہ اندازِ خرام دل کو سینے میں مے جس نے تہ و بالا رکھا

تیرے وحشی سے عبت تجھ کو خفا کرتے ہیں لوگ سب یہ باتیں جھوٹ ہیں اس بے خبر نے کیا کہا
دی جو قاصد نے خبر اُس کے نہ آنے کی اُسے رو دیا اور عاشق خونیں جگر نے کیا کہا

بہ خودی سے ہو کے آگے ہم کو آجاتا تھا ہوش طول غش کا ابتویاں دو دو پہر ہونے لگا
ابتدا میں عشق بازی سہل سمجھی تھی ہوس آخر آخر جان کا اس میں ضرر ہونے لگا

بیٹابی دل قیس کی سنتے تھے سو دکھا تھامے ابھی ہاتھوں سے جگر ہکولتا تھا
کہتا تھا اُسے کوئی ہوس اور کوئی مجنوں کل دشت میں اک خاک بسر ہکولتا تھا

میری زباں میں طاقتِ تقریر ہی نہیں ظاہر کروں کسی سے میں رد نہاں کو کیا
یارانِ رفتہ بھول گئے ہم کو اے ہوس رہ میں کسی نے لوٹ لیا کارواں کو کیا

بیچ بتادل پہ ہوس تیرے ہوا کیا صد رہ نیم بسمل کی طرح کیوں تو مری جاں لوٹا

ناحق کو ایک بلا میں مجھے مبتلا کیا او آرزوئے حسنِ بتاں ہاے کیا کیا

ہم روئے ساری عمر پہ خالی ہوا نہ دل ایک آدھ اشک نزع کے دم تک بہا کیا
سو یا جو میرے گھر کبھی وہ مست نچا بازار تلووں سے اُس کے اپنی میں آنکھیں ملا کیا

نقش پائے رفتگاں کا سلسلہ جاتا رہا ہم تو تھک کر رہ گئے اور قافلہ جاتا رہا
(ہم گئے تھے اس سے کرنے شکوہ درد فریق مسکرا کر اس نے دیکھا سب گلہ جاتا رہا)

شب کہ پشت بام پر بے پردہ وہ پارہ تھا جو ستارہ تھا فلک پر دیدہ نظر رہ تھا
جاگنے کے بعد تھیں ہمیں رگیں گل کی عیاں شب جو وقت خواب بات اسکا تہ خسارہ تھا

مشت پر بلبل نالاں کے جو برباد ہیں سب بات پر بات دھڑے سوچ میں صیاد ہیں سب
صبر کرتا ہوں جفاؤں پہ صنم اس خاطر کہ ترمی پیار کی باتیں بھی مجھے یاد ہیں سب

یہ شب کی درازی ہے تو ہم کیونکہ جنیں گے اللہ یہ کس طرح سے ہوئے گی بسر رات
کیا پوچھے ہے احوال صنم اپنی ہوس کا غم میں وہ ترے کر گیا دنیا سے سفر رات

مت اے نسیم برگ گل یا ہمیں الٹ سوتے میں اس جہیں سے دو پہیہ کہیں الٹ

بیمار محبت کی خبر پوچھتے ہو کیا ہے صبح سے کچھ اسکے تئیں بیخبری آج

کب تلک یہ چشتیں آرام کر اب اے ہوس دو گھڑی رکھ بات دیر سر زریاں چھوڑ کر

شب آنکلا تھا میرے گھر میں وہ رشک قمر یار مری فریاد دزاری سُن لگا لہنے یہ گھبرا کر
جو روئے روئے مر جاوے گا تو بدنام ہونگا میں ہوس تجکو مرے سر کی قسم اتنا نہ رو یا کر

کس کس کا ماتم کر چکے کس کس کے ہم غمخوار تھے اب یاد اپنا غم کریں ہم کو کسی کا غم نہیں

اس منزل ہستی میں ہمیں کوئی بتا دو ہم تو سبب عزم سفر بھول گئے ہیں

ہم جنکے غم میں بخود ہر شام ہر سحر ہیں افسوس وہ ہماری حالت سے بے خبر ہیں
اس کا خیال ہم کو جاگہ سے لیچلا ہے معلوم کچھ نہیں ہے اس وقت ہم کدھر ہیں

دل کا ہر حال میں ہستا تھا بہت پاس ہیں سو گیا ہاں اب کچھ نہیں دسو اس میں
جوشش اشک برا ہو دے تمہارا تم نے اک پل بھی نہ دیا بیٹھنے اس پاس ہیں

دامن کشاں چمن میں کون اس روش سے گزرا جو پتیاں زمیں پر گل کی جھڑی ہوئی ہیں

اب کہو کل کی ملاقات مقرر ہے کہاں ہے قلق دل کو مرے پر تمہیں باور ہے کہاں
جستجو میں کبھی پھر تازہ ہوس خانہ خراب پوچھتا دوس سے جو اتنا کہ تر اگھر ہے کہاں

جن کے خاطر اپنے تئیں ہم آپ میں پاتے نہیں آہ آکر وہ کبھی چھاتی سے لگ جاتے نہیں
دیکھنے سے جنکے سیری ہی کبھو ہوتی نہ تھی برسوں اب وہ ہمو صورت اپنی دکھلاتے نہیں
اس کے جانے سے ہوا ہے مضطرب کیسا ہوس ہجر بھی ہوتا ہے لیکن اتنا گھبراتے نہیں

واماندگی نے ہم کو سب سے جدا کیا ہے یار این رفتگان کو بیٹھے پکارتے ہیں

گم صحرا کو جاتے ہیں اگہ سنگ سے سڑکراتے ہیں کیا کہئے ہم کس کس ڈھب سے اُس بن جی بہلاتے ہیں
عجز کی اپنی حد نہیں باقی وہ ہی بے پروائی ہے روٹھے ہی جاتے ہیں ہوس وہ جتنا انکو مناتے ہیں

اس گل کی جستجو کو میں واں تلک گیا تھا میرا ہوس و گرنہ کیا کام تھا چمن میں

جی میں آتا ہے کہ احوال اسیران بیکھوں پھپ کے جاؤں طرف روزن زندان بیکھوں

سوزش دل کسے کہتے ہیں ہوس کیا شے ہات رکھ کر میں تر اسینہ سوزاں بکھوں ؟

(جانا تو وہاں کا چھوڑ دیا میں نے پر ہوس اس کا خیال دل سے میں نکریں کروں)

نہیں غفلت کی جا یہ لوگ کم ملتے ہیں اویسے نہ کیجیو کو تھی بیمار غم کی غمگساری میں :
کسی کا دل نہ رنجیدہ ہوا فریاد سے اپنی عجب لذت اٹھائی ہم نے چپکے چپکے زاری میں

بلائیں ہم پہ جو ہجران یار میں آئیں کسی پہ کاہیکو اس روزگار میں آئیں

اس جنوں کی دل پہ از بس دہم سرسایا ہم ہیں اب اور حوشتیں اور بادیہ پیمائیاں
کیا مزے سے اپنی کشتی تھی بسوئے وصال ہلے وہ راتیں اندھیری لے وہ تنہائیاں

کبھی زلف دن کو جو کھول دی تو نمود تھی شب تار کی جو نقاب شب کو الٹ دیا تو سحر تھی فصل بہار کی

دن جو تھے زندگی کے اپنے مقرر کائے پر کوئی ہنسکے نہ کاٹا بھی رو کر کائے

منع کیوں کرتا ہے ناصح آہ و زاری سے ہم سے کس دن خوش تھے وہ جوان بھاہو جائیں گے

تو بڑے کا چلے ہیں داغ ہم دل پر لے سامنے نہ آویں حواریں ہاتھ میں ساغر لے
اب چھپانا لطف کیا ہو چکی رسوائیاں شوق سے نعرہ کرو ڈرنا تھا جتنا ڈر لے

لکھتے ہو عیبت یار و احوال مرا اسکو یاں کام ہی آخر ہے جب تک کہ جواب لے

ناز کی اپنے پہ سو منتیں دھر لیتا ہے کبھی انگریزی جو وہ رشک فر لیتا ہے

(گئے ہم جی سے تب اُس شوخ نے یادوں سے کہا کچھ یہ ہم پر نہ کھلا کیا اُسے بیمار سی تھی) :

نہیں اختیاری سفر اہماں لیچلو میں اسیر ہوں مجھے کام بانگ در اسے ہے نہ صدائے کوں حیل سے

رور کے میری بزم میں مجکو نہ رُسوا کیجئے دیکھو ہوس کستا ہوں میں بھائے نہیں آنسو مجھے

دشت بتاتے ہو مجھے دیوانہ کہتے ہو مجھے کہہ دوں نہ مانو گر بُرائی الوافعی ہے جو مجھے کچھ دستگیری بھی کرو کر بے نقاب آئے ہو تم گرتا ہوں میں آتا ہے غش آغوش میں لے لو مجھے

ڈرے کو وعظ سے اے زاہد و ناصی ڈراتے ہو کر وہ ذکر جس میں دو گھڑی جی پہلے غم بھولے بہت دیکھا مجھے آخر کہا شاید ہوس ہے تو بڑے عرصہ میں پچا نہ مجھے بھولے پہ کم بھولے

شادی و غم جہاں میں تو ام ہے لیک غم ہے بہت خوشی کم ہے کچھ دو عالم سے ہم کو کام نہیں اب ہمارا کچھ اور عالم ہے

رونے میں رات ہجر کی ساری گزر گئی گزری بری پہ یوں بھی ہماری گزر گئی

مرض عشق کا کیا کوئی معالج ہو کہ ہائے بچتے دیکھانے اس آزار کا بیمار کوئی ذکر کچھ عشق کا آیا تو لگے کہنے آپ ہم بھی سنتے ہیں کہ کرتا ہی ہمیں پیار کوئی پس دیوار حرم رات کوئی روتا تھا یاد کر کر وہ ترا سیاہ دیوار کوئی

کیا کہوں حالت ہوس ہجر میں کیا تباہ تھی چاروں طرف نگاہ تھی زیر لب ایک آہ تھی

اس کو چہ سے گزرا میں تو اک لغزش پا تھی شاید کوئی جھانکے تھا کھڑا وزن در سے

کیا دن تھے وہ جب چھپ چھپ تم پاس ہمارے آتے تھے کانپتے تھے ہڈیاں کے ڈر سے آنسو پی پی جاتے تھے

پامال کیا ہم کو ہر اک رہزری نے صدے یہ دکھائے ہمیں بے بال پری

کیا کیا نہ رنج ہم پہ ترے بن گزر گئے اب جلد آکیں کہ بہت دن گزر گئے
رخصت کے وقت ہم نے ہو س آہ تو نہ کی صدے ہماری جان پہ لیکن گزر گئے

تنہا نہ سوز داغ سے دل ہی فغاں میں ہوئے کی صدا ہماری ہر اک استخوال میں ہو

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمستان

دنگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۱۰ صفحہ

قیمت فی کاپی مجلد للبر غیر مجلد للبر علاوہ محصول
خریدان نگار سے ایک روپیہ کی رعایت

فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدار	تاریخ عرب کی ایک وایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	ولے، بخت گزشت	ٹیلی فون نمبر ۶
دو خط	جان عالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبنمستان کا قطرہ گوہریں
سودائے خام	درس محبت	از دو اج مکرر	استقام علی صاحب
شہرہ کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک بچاری	رادعا	سرزمین دکن کی ایک لنوازشام	نوجوان شہزادہ
مطر بہ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا ورق خونیں

غالب کا ایک شعر

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہر شک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

حکیم ٹیگور فرماتے ہیں :-
”میں جاتی ہوں - رات کو
چپکے چپکے - دھیرے دھیرے
چھپ چھپ کر
اکیلی تنہا
یہ کون ؟ میرے ساتھ
قدم ملاتا آتا ہے
آہیں بھرتا رک رک کر
خاک اڑاتا پیروں سے
آہ

یہ میرا بدن
میرا ساتھ نہ چھوڑے گا
کہ وہاں جاؤں - اور اُس سے لموں
اور اس کو دیکھوں - اور اُس کو دیکھوں
اور اُس کو دیکھوں
اکیلی تنہا -“

وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اس کے ساتھ ہو - خود اُسے اپنا بدنی چولہ بھی اجیرن ہو گیا ہے - وہ خود اپنے تن من سے الگ

ہو کر اکیلی اُس کی خدمت میں جانا چاہتی ہے خدا را بتاؤ، وہ کیونکر جائے اور کیونکر لے، اور کیونکر دیکھے اُس بت کو اکیلی تنہا
جسم خاکی کے تعلق نے گرا نبار کیا
کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

کیا غالب کا بھی یہی مقصد ہے؟ نہیں۔ غالب اس سے بھی بلند جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غیر تو غیر میں خود بھی نہ دیکھوں۔ نہ میری آنکھیں۔ نہ میرا دل۔ نہ میرا کوئی۔ نہ خود میں۔ وہ یہ نہیں کہتا "اکیلی تنہا"
وہ تو اکیلا بھی اُسے دیکھ نہیں سکتا

یہ کیوں؟ شاید اس لئے کہ دایہ حسن سے مرعوب ہے۔ شاید اس لئے کہ خود اس کے دل میں اپنی نگاہوں سے
رشک کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جو اٹھ رہی ہے۔ شاید اُس کے نظارہ سے جو سرور پیدا ہوتا ہے اُسے برداشت نہیں کر سکتا
وہ کہتا ہے یہ کم بخت "میں" بھی اُسے کیوں دیکھے۔ لہذا آنکھیں بند کئے پڑا ہے۔ تصورِ جاناں کئے ہوئے۔ مگر شاید
تصور میں بھی نہ دیکھ سکتا ہو
یہ گنتھی سلجھائے کون؟

اس میں شک نہیں یہ عجیب و غریب رشک ہے جو بغض و حسد کے بھی کان کاٹتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے اپنی ناک
کٹا کر دشمن پر فتح پاتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ صبح سویرے ہوتا ہوا خون دیکھنا شگون بد ہے۔ کسی کا ٹھیاواری بزرگ کو اپنے
ہمسایہ سے رقابت تھی۔ رقابت کی آگ تیز ہوتے ہوئے غالب مرحوم کے درجہ تک پہنچ گئی۔ ایک روز انھوں نے دیکھا
کہ صبح تڑکے ہمسایہ سودا لینے منڈی جا رہا ہے۔ دل میں کہا یہ منڈی کیوں جائے؟ مگر اُسے روک کیونکر سکتے تھے۔ بیوی
سے چھری مانگی۔ "چھری لا۔ چھری لا۔" ابھی اس کا راستہ روکے دیتا ہوں "چھری لئے دوڑے دوڑے گئے اور ہمسایہ
کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ناک کاٹ ڈالی۔ ہمسایہ ہوتا ہوا خون دیکھ کر ڈر گیا۔ گھر واپس لوٹا کہیں مصیبت نہ آ پڑے۔ یہ
بزرگ بھی کٹی ہوئی ناک ہاتھ میں لئے بال بچوں میں تشریف لائے۔ کامیاب و بامراد

فلسفی کہتے ہیں "میں" کی دو قسمیں ہیں۔ اصلی میں یعنی روح اور نقلی میں یعنی نفس۔ غالب کے شعر میں ہی اصلی
میں شاید نقلی میں پر رشک کرتا ہو کہ یہ اُسے کیوں دیکھے؟ یہ دیکھنے والا کون؟ مگر یہ توجیہ درست نہیں۔ شاعر
کہتا ہے۔ میں اُسے سرے سے نہ دیکھوں۔ نہ میرا اصلی میں نہ میرا نقلی میں۔ نہ میرا کوئی میں۔ میرے دل میں رشک کی جو
آگ دھک رہی ہے وہ اجازت نہیں دیتی کہ اُسے دیکھوں۔ غیر تو غیر خود میں بھی نہ دیکھوں۔ کسی حال میں نہ دیکھوں
کسی رنگ میں نہ دیکھوں

حکیم بیگوانا ایگر کے آبشار دیکھنے امریکا گئے۔ یہ آبشار دنیا کی سب سے بڑی آبشار ہے جو سیلوں کی بلندی سے

بھاڑی چٹانوں پر گرتی ہے۔ دودھ سے زیادہ سفید اور چاندی سے زیادہ چمکیلی شفاف پانی کی چادریں جن پر صبح و شام سورج کی لہرائی ہوئی کرمیں رنگین ساڑیاں پہنے رقص کرتی ہیں اور قوس قزح کی رنگینیوں کو اس حسن سیال کی نیرنگیوں پر بچھا کر رکھتی ہیں

اس منظر کا سامنے آنا تھا کہ ٹیگور کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو اُبل پڑے اور وہ بے اختیار چلا اُٹھے

”واپس لوٹو۔ میں نہیں دیکھوں گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ آبشار۔ یہ مناظر۔

یہ قیامت۔ ہرگز نہیں۔ واپس چلو۔ تم ہے آبشاروں کے دیوتا کی میں کچھ نہیں سکتا

مجھ میں یہ قوت کہاں کہ اس حسن و سرور کے سمندر کا تناں کروں۔ واپس چلو“

میں اتے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اب شعر کی بلاغت ملاحظہ ہو کہ رشک و رقابت کا سارا الزام ”قسمت“ کے سر رکھا ہوا ہے۔ شاعر خود بری الذمہ

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

”قسمت“ کا لفظ گویا اس اقلیم معانی کا جام جمشید ہے جس کے اندر سے حقایق و معارف کی کائنات غیشہ کی طرح روشن

نظر آتی ہے۔ غالب یہ نہیں کہتے کہ میں اُسے نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ جب وہ جنت نگاہ ہے تو اُسے ضرور دیکھنا

چاہیے۔ مگر کیا کروں اس بد بخت ”قسمت“ کے ہاتھوں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے بڑھکر میرے لئے کیا مصیبت ہو سکتی ہے

کہ دیکھ سکوں مگر نہ دیکھ سکوں۔ رشک کی آگ سے جل بھن کر کباب ہو جاؤں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

محمد اسحاق (امرتی)

(نگار) ہمارے دوست محمد اسحاق صاحب نے غالب کے جس شعر سے متاثر ہو کر اظہار خیال فرمایا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ

میرزا کی ”رخسہ“ شاعری کی نہایت اچھی مثال ہے، لیکن اس سے بہتر مثال ایک اور ہے جس میں اُس نے صرف لفاظی سے کام

نہیں لیا۔ بلکہ ایک حقیقی جذبہ کو حقیقی زبان میں ادا کیا ہے لکھتا ہے:-

قیامت ہے کہ ہودے مدعی کا ہمسفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

محبوب کو دیکھ کر خود اپنے آپ پر رشک آنا، محض اک شاعرانہ حسن بیان ہے اور حقیقت سے دور، لیکن محبوب کا دوسرے کے ساتھ ہونا

یقیناً نہایت رشک انگیز بات ہے اور اس لئے دوسرے شعر میں واقعیت کی جھلک پیدا ہو جانے سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے

تزل میں جن جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک وہ جن کا تعلق صرف جذباتِ فتادگی سے ہے اور جو خالص عشقیہ کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن میں استہلال و محبت سے کام لے کر عاشق اپنے حقوق ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں رشک و حسد، طعن و تشنیع بھی کچھ معرض بیان میں آجاتے ہیں

پھر جس طرح اول الذکر جذبات کے لئے میٹر و رد کا تزل معیاری چیز سمجھا جاتا ہے، اسی طرح موخر الذکر بیان کے لئے موتن و غالب کا کلام خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ان دونوں میں افضلیت کس کو حاصل ہے تو میں بلاتامل موتن کا نام لے دوں گا

اس میں کلام نہیں کہ غالب کے یہاں رشک و طنز کی بعض عجیب و غریب مثالیں نظر آتی ہیں، لیکن اس کے بیان میں وہ بالکل نمایاں طور پر جارحانہ انداز سے کام لیتا ہے اور رشک کے جذبہ کو کھلم کھلا رشک ہی کے الفاظ میں ظاہر بھی کرتا ہے، برخلاف اس کے موتن کے یہاں یہ کیفیت نہ جارحانہ ہے اور نہ بدعتیانہ، بلکہ اس میں وہی فتادگی پائی جاتی ہے جو خصوصیات محبت "میں داخل ہے۔ غالب منہ بھڑا کر صاف صاف کہہ رہا ہے کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم دراہ ہو مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

موتن بھی غیر سے محبوب کا تعلق پسند نہیں کرتے، لیکن اس کو ظاہر کرتے ہیں اس انداز سے :-

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

مقصود تو یہی ہے کہ رقیب کی طرف نہ دیکھو لیکن منع کرتے ہیں اس طرح گویا کہ اس کے بڑے خیر خواہ ہیں اور محبوب کے جذبات کی رعایت ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے

رشک کی ایک در نہایت لطیف مثال ملاحظہ ہو

رشک پیغام ہے عنان کش دل نامہ بردار ہیر نہ ہو جائے

صورت حال یہ ہے کہ موتن نامہ برد کے ذریعہ سے اپنا پیغام محبوب کے پاس بھیج رہے ہیں، لیکن اس کے جانے کے بعد جذبہ رشک ابھر آتا ہے اور سوچتے ہیں کہ راہبروں ساٹنے جائے گا، ان کا نظارہ کرے گا، دو بد و گفتگو کی لذت اُسے حاصل ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خود بھی پیچھے پیچھے چل پڑنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پاتے ہیں۔ لیکن ان خیالات کو جس خوبی سے ظاہر کیا ہے اور ایک لفظ راہبر لاکر جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں

موتن نے اگر اس جذبہ کو صاف صاف الفاظ میں بغیر کسی تعبیر شاعرانہ کے کبھی ظاہر بھی کیا ہے تو فتادگی عشق کی شان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا مثلاً :-

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے یہ ستم اسے ہمیر دت کس سے دیکھا جائے ہے

یعنی وہ "جلی کٹی" سے کبھی کام نہیں لیتا اور متاثر ہو کر خود اپنی ہی پامالی پر قناعت کر لینا پسند کرتا ہے

سادہ ہو کی بٹ

(نذر صنف نازک)

جنس لطیف کی بے شمار ساحرانہ ادائیں ایک نوجوان تارک دنیا کے لئے دنیا کی تمام حسین و جمیل چیزوں سے زیادہ دلفریب ہیں۔ اگر اُس نے اپنی زندگی کے معصوم دور میں تم کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ ضرور مہر و ماہ کی خیرہ کن چمک اور تابناکیوں کو تمہارے حسن کے آگے پیچ سمجھتا۔ جو نہی اس کی نگاہ تم پر پڑی اس کا دل زخمی ہو گیا۔ اس کو تمہارے حسن کی قوت کا اعتراف کر لینا پڑا، جن چیزوں کو دیکھ کر اُس کا معصوم دل پہلے لطف اندوز ہو رہا تھا اُن کی دلفریبی تم کو دیکھنے کے بعد یکسر معدوم ہو گئی، تمہارا حسن ان سب پر سبقت لے گیا۔ منافذ فطرت، اہلما نے کھیت، سرسبز و شاداب مرغزار، خوبصورت چڑیاں، ان کے مسحور کن نغمے، بُرے شکوہ عمارتیں، خوبصورت حوض اور فوارے غرض ہر چیز غیر دلچسپ، بے مزہ، پر زحمت اور بے اثر معلوم ہونے لگی۔ صرف تم اور تمہاری صنف ہی تمام شوخیوں، رعنائیوں اور دل آویزیوں سے معمور نظر آئی گویا تم ایک مرصع تاج ہو۔ تمہارے ایک جلوے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں بلکہ اُس کی روح میں درد، اثر، سوز و گداز پیدا کر دیا

یہ نوجوان ایام شیرخوارگی سے جنگل میں پلا اور وہیں بڑا ہوا۔ اُس کی ماں کے انتقال کے بعد اُس نے اس بچے کو انسانی نظروں سے پوشیدہ کر دیا۔ اور برسوں معصوم بچے کو خیال تک پیدا نہ ہو سکا کہ جنگل کے علاوہ بھی کوئی دنیا اور ہر؟ اُس کے تصور میں سوائے وحوش و طیور کے کسی اور ذی روح کا وجود تھا ہی نہیں

اس کے والد نے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر کے اپنا مسکن صحرا میں کیوں بنایا؟ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ انسانوں سے اُس کو نفرت تھی، اور دوسرا سبب اُس کی رفیقہ حیات کی موت تھی۔ اس کے مرنے کے بعد سے وہ نوع انسان اور انسانی معاشرت کو ملعون تصور کرتا تھا۔ اور اسی لئے اُس نے ترک دنیا کر کے اپنے لڑکے کو رہبانیت کی تعلیم دینے کا دل میں عزم کر لیا اور اپنی ساری دولت تقسیم کر کے، اپنے شیرخوار بچے کو گود میں لے، تن بہ تقدیر صحرا کی طرف چل کھڑا ہوا اور جنگل کے ایک نہایت تیرہ و تار جھٹے میں خلوت گزیں ہو گیا

اس مقام پر اُس نے سینکڑوں باتیں اپنے کم سن بچے سے پوشیدہ رکھیں۔ ہر چند وہ بے رحم و شفیق نہ تھا۔ اور اُس کا دل بیار و محبت کے جذبات سے معمور تھا۔ تاہم وہ سختی سے اس امر کا کوشاں تھا کہ اس کے لڑکے کے کان میں کوئی ایسا لفظ نہ پڑے پائے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ کوئی رنگین، دلفریب، مسحور کن دنیا اور بھی ہے اور اس میں کوئی ذی روح مخلوق ایسی بھی ہے جسے ”عورت“ کہا جاتا ہے۔ اس گوشہ نشین کی زندگی میں وہ اپنے بچے کے دماغی نشوونما کے لئے بہ لحاظِ عمر درس دیا کرتا تھا۔ جب اس کی عمر پانچ سال کی تھی تو اُس کے والد نے پھولوں، جانوروں اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کے نام سکھائے۔ موقع و محل کے اعتبار سے وہ کبھی کبھی شیطان کا بھی تذکرہ کرتا تھا جو بقول اُس کے ”ایک پُرہیبت ڈراؤنی شکل کا منحوس جانور“ تھا

جب لڑکا دس برس کا ہو گیا تو اُس کو فطرت کی نسبتاً دقیق اور پیچیدہ چیزوں کی تعلیم دی گئی اور بعض ایسی باتیں ذہن نشین کرائی گئیں جن کا تعلق دوسری دنیا سے تھا۔ لیکن صنفِ نازک کا نام تک اس درس و تدریس کے سلسلے میں کبھی نہ آنے پایا

جب اُس نے عمر کی پندرہ منزلیں طے کر لیں تو وہ تمام باتیں جو اُس کی چھوٹی عقل میں آ سکتی تھیں ذہن نشین کر دی گئیں۔ اُس کو دنیا اور دنیا کی ساری اشیاء کے پیار کرنے والے ”خدا“ کا نام بتایا گیا۔ لیکن کائنات کی سب سے زیادہ حسین و دلفریب مخلوق، قدرت کی لطیف و نازک پنکھڑی کے متعلق اُس نے اشارتاً یا کنایتاً کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا۔ وہ ذکر کرتا کیوں کر؟ جنسِ لطیف کا تذکرہ کرنا ایک راہب کے نزدیک جو دنیا اور دنیوی زندگی سے الگ تھلگ، صحرائِ نشین ہو کر لوگ میں زندگی بسر کر رہا ہو بیکار تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا سراسر فضول تھا۔ اُس کی زندگی زہد و قناعت استغنا و بے نیازی کی زندگی تھی

لڑکا اب بیس سال کا ہو گیا، اب اس کا والد اُس کو قریب کے شہر میں لے جانا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ اُس کو ضعف و نقاہت سے تن گھیرا اور تکمیلِ ضروریات کے لئے اب چلنا پھرنا دوہرا ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس فکر میں کھویا سا رہنے لگا کہ ”میرے بعد میرا لڑکا کیا کرے گا؟ وہ دنیا کے لئے اور دنیا اس کے لئے نا آشنا تھی! تنہا کیا وہ اپنا پیسٹ پال سکے گا؟ میرا بچہ بھڑیلوں اور وحشی جانوروں کو جانتا ہے، لیکن اُن میں بھلا انسانی ہمدردی کہاں؟“ اس کو بخوبی علم تھا کہ اُس کے بعد لڑکے کو جو کچھ ورثہ ملے گا وہ صرف اُس کی ایک جھولی اور ایک عصا ہوگا، جس کا ملنا اور نہ ملنا برابر تھا

شہر میں بہت کم آدمی تھے جو اُس کو ایک آدھ روٹی نہ دیدیتے ہوں۔ اگر وہ حرص و آرزو کا بندہ ہوتا تو اُس نے ڈھیروں دولت جمع کر لی ہوتی۔ شہر کے سارے چھوٹے بچے اُس کو جانتے تھے، جب کبھی اُس کا گزر ہوتا تھا تو وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلایا کرتے تھے ”ٹھیرو سائیں ٹھیرو، یہ لیتے جانا“ کیونکہ وہ شہر میں بہت ہر دلعزیز تھا، لوگ اُس پر ترس

کھاتے تھے، اُس سے محبت کرتے تھے۔ لیکن ان ترس کھانے والوں میں کوئی عورت شامل نہ تھی کیونکہ وہ ان سے دُور رہا کرتا تھا

جب اس کو یقین کامل ہو گیا کہ اُس کی تعلیم نے اُس کے بیٹے کے دل و دماغ میں گہرے نقوش اختیار کر لئے ہیں اور اُس کے اثرات زائل نہیں ہو سکتے تو اُس کو شرمسار کیا

یہاں نوجوان راہب کو ایسی ہزاروں چیزیں نظر پڑیں جن کو اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا، اور جسے وہ بالکل ناواقف تھا

معصوم نوجوان فرط حیرت و انبساط سے ایک ایک چیز کے متعلق پوچھنے لگا ”وہ جو سامنے نظر آ رہا ہے کیا ہے؟“ اُس کے دل نے خفقت سے کہا ”بیٹا! اُسے محل کہتے ہیں!“ اور وہ دوسری طرف ہے؟“ وہ فوراً رہے!“ یہ؟“

”بت ہے۔۔۔ بیٹا!“ ان چیزوں کو وہ نہایت شوق سے دیکھ رہا تھا کہ چند حسین و جمیل، کنواری لڑکیاں اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی گزریں۔ وہ فوراً اُن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب اُسے محل حسین نظر نہ آتا تھا، فوارہ کی دلفریبی غائب ہو چکی تھی، بت میں دلاویزی نام کو نہ رہی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھا ”ابا! وہ کیا ہے، وہ! جو اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس کا کیا نام ہے؟“ ضعیف راہب نے جس کو اس سوال سے ازلی نفرت تھی بدمزہ ہو کر جواب دیا ”یہ۔۔۔ یہ ایک پرندہ ہے بیٹا! اس کو بطخ کہتے ہیں!“ ”کیسی خوبصورت چڑیا ہے!“ نوجوان راہب نے سرور و انبساط کے عالم میں جھومتے ہوئے کہا ”اے دل نواز طائر! مجھے اپنے مسخو کُن نغمے سنانا جا! کیا تو مجھ سے بات نہیں کرے گا؟ ابا! پیارے ابا! اگر آپ مجھ سے محبت ہے تو اس طائر کو اپنے ساتھ لے چلے، میں اس کو خود دانہ پانی دیا کروں گا“

حسن (حیدر آبادی)

ڈان فانیٹن فرانسیسی فسانہ نگار

نگار کی پرانی جلدیں مکمل برائے فروخت

میرے پاس نگار کے جملہ فائل جتنے بھی آج تک شائع ہوئے ہیں موجود ہیں اور ہر ایک سال کا فائل پانچ روپیہ میں دید و نگا پرچے ابھی حالت میں ہیں

پتہ۔ زمین العابدین بتوسط دکان محمد باقر حاجی عبدالنظار۔ پتھر گھٹی۔ حیدر آباد دکن

باب المراسلۃ والمناظرہ

جناب محمد عطاء اللہ صاحب جہلم۔ سیالکوٹ،

دُنیا کا امن و سکون کہاں ہے۔ مذہب میں یا الحاد میں ؟

در اصل یہ اختتامی قسط ہے اس مضمون کی جو زیر عنوان ”ملاحظات نگار“ خدا لا مذہبیت کے زاویہ نگاہ سے ماہ اگست میں سپرد قلم کیا گیا ہے پھر ستمبر میں ”مسکریں خدا کے خیالات پر تبصرہ“ کیا گیا ہے اور جو نتیجہ نکلا وہ ہمارے سامنے ہے۔ مولینا! آپ مذہب کے مفہوم کو بدل کیونکر سکتے ہیں۔ ”مذہب“ ایک نہایت پرانی شے ہے اس کی تعریف (Definition) بدلتوں سے ہوتی آئی ہے۔ بڑے بڑے اراکین مذاہب نے بڑی بڑی معرکتہ الآراء تقاریر و تجاریر میں اُس ”مذہب“ کا مفہوم سمجھایا ہے جن کے وہ علمبردار ہیں اور یقیناً ان کی شہادت ان کے اپنے مذہب کے متعلق کس قدر واقع ہے بہ نسبت آپ کے خیالات کے اور بمقابلہ آپ کے مفہوم مذہب کے جسے آپ سمجھانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اظہر من الشمس ہے

آپ نے بڑی محنت سے ایک تعریف بنا فرمائی ہے کہ ”مذہب نام ہے انسان میں احساسِ انسانیت“ یہ تعریف نیا و فحشوری کی ساخت ہے اس لئے کون باور کرے گا کہ واقعی ”مذہب“ کا مفہوم ہے بھی یہی۔ مولینا! یہ کہہ دینا کہ ”اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا“ کسی طرح ”مذہب“ کے حقیقی مفہوم کو رد نہیں کر سکتا۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ خواہ میں یا آپ ”مذہب“ کو کچھ ہی سمجھیں دراصل جو ”مذہب“ والے ”مذہب“ کو سمجھتے ہیں وہ کیا ہے۔ دیکھئے:۔

جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کہتا ہے:۔

”خواہشات اور احساسات کی زبردست تحریک اور ان کا میلان بجانب ایک ممکن اعلیٰ تریں

ہستی کے جسے انفس التفاس تسلیم کیا جائے اور جو خواہشات کی تمام اسفل ہستیوں سے منزہ و بالاتر ہو۔ ”مذہب“ کا پنجوڑ اور اس کی روح ہے۔

پروفیسر میکس ملر (Max Muller) اپنی کتاب ”ابتداء مذہب“ (Origin of Science) میں لکھتا ہے :-

”مذہب“ وہ متحرک قوت ہے جس سے انسان لامحدود (خدا) کو پہچانتا ہے۔
 بیمن کڈ (Benjamin Kidd) اپنی کتاب ”سوشل ایوولیوشن“ میں فرماتے ہیں :-
 ”ایمان و یقین کی کوئی قسم“ مذہب“ نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس میں شخصی اخلاق دینی کے لئے ”وراء البرہان“ اجازت نہ پائی جائے۔

جیمس مارٹینو (James Martineau) اپنی کتاب ”مطالعہ مذہب“ (A study of religion) میں فرماتے ہیں :-

”ایک وحی و قوم خدا پر مبنی ایک ایسے دماغ دار ارادہ علوی (جو تمام کائنات پر حکمران ہو اور انسان سے اخلاقاً منسوب ہے) پر ایمان رکھنے کا نام ”مذہب“ ہے۔“
 رومانس (Romances) ”مذہب کے متعلق چند خیالات“ کے صفحہ اہم پر رقمطراز ہیں :-

”کوئی نظریہ جسے ”مذہب“ کے نام سے پکارا جاسکتا ہے اس کے اختصاصی خط و خال یہ ہیں کہ وہ اشیاء کے مصدر یا مصادر اولین کے متعلق بیان کرے اور پھر وہ اُس مصدر اولین کو عقل کل۔ قائم بالذات اور ذاتی فطرت سمجھے۔ ”مذہب وراء العقل“ یا ”مذہب قانون فطرت“ یا ”مذہب اخلاق و انسانیت“ وغیرہ وغیرہ کتنا جس میں کہ ”علت اولین“ کی ذات متعین نہ ہو محض بے مبنی ہے۔ ایسا ہی لایعنی جیسا کوئی ”محبت خلقت“ یا ”دلالت استوا“ کے متعلق کہے۔“

پروفیسر جارج ہاجس حکیم النبیات امریکہ (Rev. George Hodges, D.D.) فرماتے ہیں :-

”ایک نادیدہ طاقت (جو کائنات عالم اور انسان پر ہر طرح حاوی و حکمران ہے انھیں بناتی ہے اور انکی پرورش کرتی ہے) کے احساس کا نام ”مذہب“ ہے اور پھر اسی ”نادیدہ طاقت“ کو اپنے اندر بھی محسوس کریں جو ہمارا ”نفس حقیقی“ ہے اور جو ہماری ذات طبعی سے جدا ہے اور غیر فانی ہے۔ ”روح انسانی“ اور ”ذات الہی“ کے صحیح رشتے کے تعین کرنے کی کوشش کا نام ”مذہب“ ہو۔“

سیموئل شلمان حکیم النبیات (Samuel Shulman, D.D.) جو شہر نیویارک امریکہ میں

جامعہ بیت ایل کے ربی ہیں اور شریعت موسوی کے ایک رکن اعظم ہیں۔ فرماتے ہیں :-

”مذہب“ میں دو عنصر ہیں انسان اور خدا۔ یہ ہر دو عناصر لاینفک ہیں اگر مومن خدا کو
(یعنی خدا) کو مٹا دیا جائے تو باقی جو رہ جائے گا وہ ایک ”فلسفہ زندگی“ ہو گا نہ کہ
”مذہب“ (مولانا غور فرمائے)

پروفیسر جان آگسٹس رابن حکیم الہیات (John Augustus Rayan D.D.) فرماتے ہیں:-

”یقیناً ”مذہب“ ایک ذاتی رشتہ ہے مخلوق و محکوم ”انسان“ اور خالق و آقا خدا
کے درمیان اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان کا بے اختیارانہ و مجبورانہ اپنے آپ کو
محکوم کے لئے خدا کے سپرد کر دینے کا نام ”مذہب“ ہے یعنی اس ذات علی الاطلاق و
فوق الفطرت کے سپرد کرنا جس کے دست نگر ہو نیک انسان کو احساس ہے اور جس کی
قوی امداد کی ضرورت کو وہ محسوس کرتا ہے اور اسی ذات کو وہ اپنی تکمیل اور امن و امان
کا سرچشمہ سمجھتا ہے“

ڈاکٹر چارلس اینن ڈیل ایم اے ایل ایل ڈی (Dr Charles Annandale M.A., LL.D.) مذہب کے
لغوی معنی یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

”اس احساس تقدس کا نام ”مذہب“ ہے جو انسان کو حضرت باری تعالیٰ کا ہے
”خدا کو معبود سمجھنا اس سے محبت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا یہی مذہب ہے“

جان سپارگو (John Spargo) اپنی کتاب مارکسین سوشلزم (Marxianism)
(Socialism) صفحہ ۳۳-۳۷ پر لکھتا ہے:-

”ہم مختصر کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ایک اعلیٰ ذمی الارادہ قوت ”خدا“ میں ایمان
رکھنے اور اس کی پرستش کرنے اور اپنی زندگی کو اُسی خدا کی مرضی یا خواہش یا احکام کے مطابق
بسر کرنے کا نام ”مذہب“ ہے“

چنانچہ اصول ”مذہب“ یہ ہیں:-

- الف = حاکم کائنات ”خدا“ پر ایمان لانا اور اس کی پرستش کرنا
- ب = اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی ایک روحانی ہستی یا روح بھی ہے جو آتی ابدی اور غیر فانی ہے
- ج = اس بات پر ایمان لانا کہ انسان کی انتہائی بہتری اور خوشی ابدی اور اخلاقی اسی میں ہے کہ وہ
مرضی و منشاء خداوندی کے مطابق بسر کرے
- > = اس بات پر ایمان لانا کہ چونکہ ”خوت انسانی“ ”ابولیت خداوندی“ پر منحصر ہے اس لئے

تمام تمدنی بہتری و بہبودی اسادہ خداوندی کے سامنے سرطاعت خم کر دینے میں ہے۔

میرا خیال ہے مولانا۔ میں نے عیسوی اور موسوی "مفہوم مذہب" نہایت بے لوث الفاظ میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور چونکہ اسلام کی کوئی اپنی نئی شریعت نہیں ہے بلکہ دین موسوی کی تعلیم کو فروغ دینا پیغمبر اسلام کا لائف مشن تھا تاہم احکام شرعی اسلام میں طاعت و عبادت خداوندی نکال دیجئے اور "روح" جسے "امر ربی" کہا گیا ہے اس سے منکر ہو جائے۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا جھگڑا نہ رہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ قربانی۔ احکام خداوندی نہ رہیں اور فرائض نہ سمجھے جائیں اب جو کچھ باقی رہے اُسے پھر بھی "مذہب" ہی کہئے گا؟ معاف رکھنا اگر پھر بھی وہ "مذہب" ہی رہا اور آپ اُسے "مذہب" کہتے رہے تو آپ نے "مذہب" پر لانا نہایت ظلم و اور کھایا ہی نہیں بلکہ "قانون اخلاق" کی صورت ہی مسخ کر دی اور سینہ زوری سے اُسے "قانون مذہب" کے نام سے پکارا حالانکہ فلسفہ

"اخلاق" اور "مذہب" بالکل جدا جدا قوانین ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے جدا اختصاصی پہلو رکھتا ہے علاوہ یہودیت۔ عیسائیت اور اسلام کے جو دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں ایک دو بڑے بڑے مذاہب اور بھی دنیا میں رائج ہیں مثلاً "ویدک دھرم" جو غلط العوام ہو کر "ہندو ازم" (Hinduism) کہلاتا ہے حالانکہ "ہندو" ہونا "مذہب" سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ قومیت سے متعلق ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۷ء میں جن دنوں میں بغداد میں تھا ایک پارٹی میں ہمارے ایک عرب آشنا نے جب بنگال۔ مدراس۔ یوپی اور پنجاب کے باشندے مختلف زبانیں بولتے ہوئے مختلف رنگ و روغن اور وضع و قطع کے دیکھے مگر پھر بھی ان سب میں ایک یگانگت سی پائی تو حیران ہو کر دریافت کیا "انت کلکم ہندو؟" (کیا تم سب ہندوستان کے باشندے ہو) جواب تھا نعم (بیشک) خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ دیکھئے رگ وید کا پہلا منتر "اگنی پڑے پڑو ہتم" سے شروع ہوتا ہے یعنی خداے وحدہ لا شریک کی تعریف کرو اس کی مدح و ثنا کے گیت گاؤ پھر وید کی تعلیم ہے:-

Deva, Yasya, Prashishan, Upasate, Vistwa, Yasya, Valda,
Atanda, ya Vidhem, Haviha, Divaya, Kasma

میتوا, Yasya, Uditan, Chaitya, Jasya
یعنی (میترا) شانہ ہی، ایک ایسا منبع ہے جس سے انسان کی روح کو حقیقی طاقت مل سکتی ہے تمام کائنات اُسی کی پرستش کر رہی ہے اجرام ملکی و اجسام ارضی اسی کے حکم کے مطیع ہیں۔ اُسی کی پرستش سے نجات مل سکتی ہے اگر ہم اس کی عبادت نہیں کریں گے تو ہم ہلاک ہو جائیں گے

پھر دیکھ کا یہ منتر بھی ملاحظہ ہو :- ^{اندھین} ^{لوکا} ^{نام تے} ^{اسرے}
Asurya, Namte, Loka, Andhan

^{تساورتا} ^{نام تے} ^{پرتیانی} ^{بھنتی}
Tamsavrita, Namate, Pratyak, jachanti, Neya
^{ہنوجنا} ^{چا آم}
Chatan, Manajana

یعنی وہ لوگ جو خدا کی پرستش نہیں کرتے وہ مرنے کے بعد ایسے جہنم میں ڈالے جائیں گے جہاں تاریکی مطلق ہے اور کسی قسم کی راحت نہیں ہے

اسی "ویدک دھرم" کی ایک جدا شدہ شاخ "بدھ مت" ہے "تھائگت" کے پیرو اس وقت بھی تعداد میں 'سیخ کی بھیڑوں' سے شاید دوسرے درجے پر ہیں۔ گوتم کی تعلیم نہایت سادہ - صاف اور عقل انسانی کے قابل قبول ہے مگر باوجود اپنی اس سادگی کے اور باوجود اس فرقہ کی اس قدر بہتات کے "بدھ مت" کو دنیا کے مذہب میں "مذہب" کا لقب نہیں دیا گیا۔ اس کو مذہب والوں نے "مذہب" تسلیم نہیں کیا، ہم اور آپ خواہ بدھ دھرم کو کچھ ہی سمجھیں مگر مذاہب عالم کے علمبردار کلمہ اجماع اسے "مذہب" کی صفت سے خارج سمجھتے ہیں ڈاکٹر ڈی۔ جی۔ برنٹن (D. G. Brimton) جو خود بھی بدھ مت ہیں فرماتے ہیں :-

"اس سے زیادہ غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ ہر نظریہ مذہب میں کسی خدا

یادوتاؤں پر اور روح غیر فانی پر اور ملکوت روحانی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ جبکہ

مذہب موجودہ جس کے پیرو دنیا میں آج سب سے زیادہ ہیں یعنی بدھ دھرم مستزکر ہالا

ہر ایک اعتقاد کی تکذیب و تردید کرتا ہے "

مگر اس رائے پر علمائے مذاہب کا متفقہ فیصلہ کیا ہے۔ سنئے وہ فرماتے ہیں :-

"وہ مذہب جو خدا کی پرستش سے معرا ہو 'مذہب' نہیں بلکہ محض 'استشہادیت

باطلہ" (Anachorism) ہے "

ایک عالم مذاہب جس نے "اسلام" "ویدک دھرم" "عیسائیت" "برہم سماج" "دیوسماج" کے اصول کی تحقیقات میں اپنی زندگی کے ساٹھ پینسٹھ سال بسر کئے ہیں کہتا ہے :-

"مذہب صرف یہی نہیں کہ موجودہ جسم کے متعلق ان اخلاقیات کی تعلیم کا نام ہے جو ہماری

موجودہ زندگی کو ہمارے لئے اور ہمارے ارد گرد کے جملہ انسانوں کے لئے مفید اور پر راحت

بناتی ہے بلکہ "مذہب" اپنے حلقہ اثر اور اپنے دائرہ تعلیم میں روح کے مستقبل کے پروگرام

کو بھی شامل کیے ہوئے ہے ” (انوار عالم صفحہ ۴۶)

خان بہادر میرزا سلطان احمد خاں صاحب (جو علاوہ ایک مسلم فلسفی ہونے کے ”تازہ ترین پیغمبر“ کے غلط رشید بھی تھے) مذہب کی تعریف یوں فرماتے ہیں :-

” مذہب وہ قانون ہے جو باحفاظہ اخلاق یا تصرفات ضمیری ایک اعلیٰ طاقت علت العلل کے

منشا اور ذات تک انسان کی رسائی کرنا چاہتا ہے اور ان ہدایات سے آگاہی بخشتا ہے جو

اس منزل تک اس کی رہنما ہو سکتی ہے ”

گور و نانک دیو کا ” سکھ دھرم “ موجود زمانے کے ” مذہب “ میں ایک نمایاں ہستی رکھتا ہے مگر کس کو انکار ہے کہ ” اک اونکار ست نام - کرتا پرکھ - نر بھو - نر ویر - اکال مور ت - ابونی سے بھنگ گور پر ساد “ یعنی ایک وحدہ لا شریک خالق کائنات - الحق و گردگار - بے خوف و بے آزار - اذکی - ابدی - لم یلد و لم یولد - حاضر و ناظر و جاری و ستاری خداوند حکیم کا ” جب “ یعنی ورد کرنا ہی انکا اساس مذہب ہے - ” نام جپنے “ کے بغیر نجات ہے نہ ملتی اور نہ کوئی ” سکھ “ بغیر اس کے اپنے دھرم کا صحیح پیرو کلا سکتا ہے

میرے مندرجہ بالا بیان کے بعد غالباً بے شک و ریب یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اگر ” خدا کی پرستش و نیایش “ کو ” مذہب “ سے خارج کر دیا جائے تو باقی خاک بھی نہیں رہ جاتا جسے ” مذہب “ سے تعبیر کیا جائے مولینا ! ” مذہب “ نام ہی ہے صرف ” خدا کی پرستش و نیایش کا “ ورنہ باقی تو ” فلسفہ “ اور ” اخلاق “ ہے ایک ” پابند مذہب “ فلسفہ اور اخلاق کے قواعد یا شرائط کا بہت سی باتوں میں پابند ہو گا لیکن ایک فلسفی اور ایک حکیم اخلاق ” بہت سے امور میں ” مذہب “ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے یا یہ کہ ایک فلسفی یا ایک ” حکیم اخلاق “ پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کوئی مذہب بھی رکھتا ہو یا کسی دین اور مذہب کا پابند اور مقلد ہو

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کچھ آپ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یہی ہے کہ ” مذہب “ کا مفہوم کچھ اور ہے لیکن یقیناً آپ غلطی پر ہیں - جہاں اور ہزار قسم کے صحیح اجتہادات کو آپ کام میں لاتے ہیں اور جس کے باعث بے شمار فتاوے تعزیری شرعی کے مورد ٹھہرتے ہیں وہاں کیا ضرور ہے کہ اس فرسودہ اصطلاحی لفظ ” مذہب “ کو خواہی نخواہی غلط طور پر استعمال کیا جائے اور پھر اس کے صحیح مفہوم کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے - حالانکہ درست یہی ہے کہ جس شے کا نام مذہب ہے وہ محض لغویات و خرافات کا پلندہ ہے اور خارج از عقل و ادراک بات ہے اُمید ہے آپ اس پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیں گے

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں

” رہ گئی عقلی آزادی سو اس کا ثبوت لا اکر وہ فی الدین سے زیادہ اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے “

ڈاکہ ڈالتا رہا ہے جتنے کہ صدیوں کی یہ کوششیں یوں رنگ لائیں کہ عورت ”ہیکار کھلونا“ اور ”محض منائشی سامانِ نیت“ یا ”صرف آلہ ہوس پرستی“ رہ گئی۔ جو کچھ مرد نے عورت سے آج تک سلوک روا رکھا ہے کیا اس کا لازمی ”ردِ عمل“ یہ نہیں ہے کہ اب وہ ”باغی“ نظر آتی ہے اور مرد اس کے اس باغیانہ طرز و روش کو دیکھ کر دانت کچکچاتا ہے اور پھر انتہائے بزدلی سے نہایت اخلاق سوز اور انسانیت کش حملے کرتا ہے

میں کہتا ہوں مردوں کا یہ طعنہ عورتوں کو مجبور کر دے گا کہ وہ ایسی بے حیا اولاد پیدا کرنا ہی بند کر دیں۔ ”بر تھہ کنٹرول“ کا بھی آغاز ہے۔ مردوں کے اخلاقی حملوں کی اگر یہی کیفیت رہی تو معلوم نہیں دنیا کا ”حکمران“ اور ”مطلق العنان“ ”بے ہمتا“ مرزا اپنے مایہ ناز و فخر عالم نیتپولین۔ اکبر۔ شیکسپیر۔ لیڈن۔ مصطفیٰ کمال۔ ٹیگور۔ اور گاندھی کہاں سے اور کیونکر پیدا کرے گا۔ کیا مرد کو یہ توقع ہے کہ وہ کسی ”خلافت فطرت“ عملِ جدید میں کامیاب ہو کر عورت سے بے نیاز ہو جائے گا ؟

مرد کی آنکھوں پر ابھی تعصب کی پٹی کس کر بندھی ہوئی ہے ہاں البتہ بنیاد ایسی ہستیاں بالکل اندھی نہیں ہو رہیں تاہم تعصب کی عینک سے بے نیاز نہیں ہیں۔ مغرب کی ”جنس لطیف“ بتلائے تو اور کونسی جنس میں تبدیل ہو گئی ہے ؟ کیا وہاں کی ”جنس لطیف“ اب ماں۔ بہن اور بیٹی کے لقب سے نہیں پکاری جاتی ؟ کون کہتا ہے کہ ”نظامِ تمدن میں اُس کی کوئی گنجائش نہیں“، ”نظامِ تمدن کس کا بنایا ہوا ہے ؟ آپ سمجھتے ہیں ”نظامِ تمدن“ ایک جامد شے ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی ؟ ”نظامِ تمدن“ ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ یہ چیز انسانی اختراع ہے۔ اُس کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے ہر وقت اس میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ ”نظام“ نوعِ انسانی کے دونوں اصناف پر مساویانہ حاوی رہا ہے اور رہے گا۔ اس ”نظام“ کی تخلیق و تشکیل و رد و بدل میں عورت کا نصف حصہ ہمیشہ محفوظ رہا ہے اور رہے گا۔ اگر آج کے ”نظامِ تمدن“ میں بقول آپ کے اس کی کوئی گنجائش نہیں تو کل کے نظامِ تمدن میں یقیناً ہوگی

مردوں کو دانت کٹکٹانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ نامردانہ حملے کسی طرح روا نہیں ہیں۔ دنیائے عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو کوئی حقوق ”دینے“ سے نہیں دیے گئے۔ ”حقوق“ مانگ کر لینے دینے کی شے نہیں ہے یہ تو بچپن لینے اور زبردستی منوانے کی چیز ہے۔ عورت نے جو کچھ آج تک حاصل کیا ہے اپنے زورِ عقل و فطرت سے کیا ہے۔ اور آئندہ جو کچھ لے گی اسی کے بل بوتے پر لے گی اور مرد اگر اسے اپنی اس اکڑ خانی کو نہ چھوڑا تو اسی طرح دستِ حسرت ملتا رہے گا اور اپنے سلوک نامستحسن سے دن بدن عورت کی نظر میں ذلیل ہوتا رہے گا۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ”عورت“ کی حوصلہ افزائی کریں جو حقوق مانگتی ہے وہ دیں بلکہ جن جن حقوق کے لئے اُس نے استغاثہ بھی نہیں کیا ان کی طرف بھی اُس کی توجہ مبذول کروائیں اور ان کے حصول میں اُس کی ہر طرح مدد کریں۔ یہ مفت کرمِ دانش

والی بات ہے اور خواہ مخواہ کا احسان ہے جو مرد عورت کی گردن پر رکھے گا ورنہ عورت کا قدم جس جانب اٹھ چکا ہے اب کوئی طریقہ جابرانہ اس کو واپس لانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ فتدبر و یا اولاً بصر

”باب المراسلة والمناظرة“

- مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت جناب منظر الحق صاحب رضوی چیپردی کریم چک نے تین سوالات کئے ہیں
- (۱) مذہب اور اس کے مقاصد کیا ہیں ؟
 - (۲) قیام جمہوریت سے مارشل کمال کا مقصد کیا ہے اور ترکی کے اجتہادات جدیدہ کے صلہ میں کفر کا جو متنہ دنیائے اسلام نے دیا ہے وہ کہاں تک بجا ہے ؟
 - (۳) نیاز کا مشن کیا ہے ؟

پہلے اور دوسرے سوال کے جواب میں آپ نے ذرا وضاحت سے کام فرمایا ہے مگر ”مذہب“ کی تعریف *Definition* آپ کی خود ساختہ ہے نہ کہ وہ جو دراصل ہے۔ میں نے اس کے متعلق کافی ودافی پہلے ہی عرض کر دیا ہے جس کا دہرانا بے جا ہے۔ ”مذہب“ کا دشمن ہونا برا نہیں ہے بالخصوص جبکہ ”مذہب“ کا مفہوم وہی ہو جو دراصل ہے نہ کہ وہ جو آپ خیال فرماتے ہیں۔ آپ کا فرمانا تو ایک قول بے دلیل ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے ”ذمت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے“ ”مذہب“ اپنے کارناموں سے پرکھا جانا چاہئے۔ وہ کونسا مذہب ہے جو دوسرے کو برا نہیں سمجھتا۔ تبلیغ مذہب۔ اور شد ہی یاد *Conversers* جو مذہب کی جان ہے اور جس کے بغیر ”مذہب“ معدوم ہے خود ایک لعنت ہے۔ ایک مقراض بے پناہ ہے جس نے قبائے انسانیت کے بے دریغ ٹکڑے ٹکڑے کر لئے ہیں۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے ؟

حیران ہوں کہ کس بنا پر آپ نے کم دیا کہ تاریخ عالم کی خونریزیوں سے ”مذہب“ کا دامن پاک ہے اور وہ کونسا مذہب ہے جو خونریزی اور خون آشامی کی تعلیم دیتا ہے ؟ ”مذہب“ کی خونریزیوں پر تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے میں اور تو نہیں حضرت کی توجہ سورۃ النساء رکوع ۱۲ آیت سوم کی طرف مبذول کروا تا ہوں ”فخذوہم و اقتلوہم حیث ثقتموہم“ کسی جنگیز یا ہلاکو کا حکم مظالم انہ اور ارشاد انسانیت سوز نہیں ہے مولانا یہ حکم خداوندی ہے۔ یہ ”الرحمن“ اور ”الرحیم“ ہستی کا منشاء مبارک ہے

حضرت دیکھئے سورۃ التوبہ رکوع اول آیت ”فاذبحوا الذین ظننتم انکم ملوا علیہم فاعلموا انکم لم ملوا علیہم فاعلموا انکم لم ملوا علیہم“

وجہ تموہم وخذوہم واصرہم وقعدوا لہم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا بالزکوۃ فخلو سبیلہم۔ ان الله غفور الرحیم

غفور الرحیم فرماتا ہے :-

”ان چار مہینوں کے بعد ان انسانوں کو جس طرح تمھارا جی چاہے۔ آرو پیو قتل کرو
پکڑو قید کرو جو جی چاہے منظم روارکھو (حتیٰ کہ یہ مجبور ہو جائیں تمھارا دین اختیار
کرنے کو) اور اگر اپنا مذہب بدل ڈالیں تو پھر کچھ تعرض نہ کرو“

غفران اور شان رحیمی ہے

حضرت ملاحظہ فرمائے سورۃ المائدہ آیت ”رَاتْمَلِجُوا الَّذِينَ يَحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يَقْتُلُوا أَوْ يَاصِبُوا أَوْ يَفْقَطِعَ أَبْهَدِيَهُمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُغَوِّمُوا مِنَ الْأَرْضِ ط
یہ لوگ جو خدا اور رسول کے برخلاف جنگ کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں کے برخلاف) اور دنیا میں فساد پھیلاتے
پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو خواہ قتل کرو خواہ پھانسی پر لٹکاؤ خواہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو خواہ ان کو جلا وطن
کردو (تمھارے لئے سب جائز ہے)“ حضرت مولانا۔ یہ مذہب کا حکم ہے اور المامی کلام ہے۔ کسی زار روس کا نافذ
کردہ حکم نہیں ہے

حضرت غور فرمائے سورۃ الانفال رکوع دوم آیت ”فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتُمْ إِذْ
رَمَيْتُمْ دَلِكُنَّ اللَّهُ رَحْمٰی وَبِیْسِلِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَآءًا حَسَنًا۔ اِنَّ اللَّهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ اے مسلمانوں تم نے جو
لوگوں کو تہ تیغ کیا ہے۔ اور تیروں سے ان کی جانیں لی ہیں یہ سب تیغیں اور تیرویوں سمجھو کہ اللہ نے خود چلائے ہیں تم نے
نہیں چلائے اور یہ اس لئے کہ تم کو اس کا اچھا انعام صلہ میں دے کیونکہ اللہ سب جانتا سنتا ہے“

یہ وہ قتل و غارت انسانی کا روشن جواز ہے جس کے بھروسے پر مذہب کے قائدین ہی نہیں بلکہ امین الملت
بمیں الدولہ محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب اور فرخ سیرنگ نے انعامات موعودہ الہی حاصل کئے ہیں۔ فتدبر !
پھر اور دیکھئے سورۃ البقرہ رکوع ۲، آیت سوم ”وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ اِلٰی آخِرہ۔ یہ انسانی
بائیکاٹ کی تعلیم ہے جو مذہباً جائز قرار دی گئی ہے۔ مغلوب قوم اپنا رشتہ فاتحین سے جوڑنا اپنے لئے باعث فلاح سمجھتی ہے
یہاں مذہب کا حکم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں خواہ کیسی ہی بھلی کیوں نہ ہوں جب تک ان کو اپنے مذہب میں
نے آؤ ان سے مت شادی کرو اور نہ ہی مسلمان عورتیں ان میں سے کسی شریف انسان کو دو۔ گویا وہ عورتیں اور
مرد بحیثیت انسان مذہب کی نگاہ میں ہیج ہیں

مولینا اور لیجئے۔ سورۃ النساء رکوع اول آیت سوم ”وَإِنْ خِفْتُمْ اِلٰی آخِرہ اس آیت
میں ”مَا مَلَكَتْ اِيْمَانُكُمْ“ کی کوئی تاویل آپ بھی کیجئے۔ اگر جنگ کے بعد پکڑ کر لائی ہوئی موصوم بیگنہ عورتوں
کو بیسٹ بکری کی طرح اپنا جائز مال تصور کر کے ان سے بے غل و غش بغیر نکاح کے لطف صحبت اٹھانا ”مَا مَلَكَتْ اِيْمَانُكُمْ“

کے تحت میں نہیں ہے تو اور کیا ہے اور اگر یہی ہے تو پھر غلامی اور بیچ انسانی کی ترویج میں ”مذہب“ نے نہایت شد و مد سے حثیت کی ہے اور یہ ایک ایسا بدنامہ داغ ہے مذہب کی پیشانی پر جو کبھی نہیں دھل سکتا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ مشتے نمونہ از خروارے ہے اور نہ ہی میری اس تحریر سے یہ مطلب ہے کہ صرف یہی ایک ”مذہب“ ہے جس میں ”انسانیت سوز“ احکام مذہباً جائز ہیں۔ نہیں! بھیڑیں سب منہ کالی ہیں ہر ”مذہب“ اس قسم کی خرافات سے پُر ہے اور بجا طور پر ہر مذہب کو اپنی اس تعلیم پر فخر بھی ہے کیونکہ وہ ان احکام کو انسانی احکام نہیں بلکہ خدائی حکم اور الہام و وحی سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے اٹل اور انٹ ہوئے کا دعویٰ دے رہے۔ آپ ان مسلمات کو کسی فقیہ کی تنگ نظری سے تعبیر نہیں کر سکتے کیونکہ ان احکام کی پشت پر خود ادا امر الہی کی مٹ رہے جو ”مذہب“ کی بیخ و بن میں آپ کی کوئی تادیل جو ان احکام کے جواز میں پیش کی جاوے گی وہ ”تاویل“ سے زیادہ نہ ہوگی آپ (Fact) واقعہ سے کسی طرح منکر نہ ہو سکیں گے

کوئی ریفارمر سے ریفارمر مولانا یا رکن مذہب یا ربی یا پنڈت الہام و وحی و کلام ربانی کا منکر نہیں ہو سکتا ہاں اگر آپ تمام الہامی کتابوں سے صاف انکار بھی کر جائیں اور انھیں بنیان مذہب کی اپنی اپنی تصانیف بھی ماننے لگ جائیں تو جہاں مذہبی دنیا میں آپ کے لئے کفر کا فتوے ہے وہاں یہ پھر بھی آپ نے مان لیا کہ کم از کم ان احکام کو نافذ کرنے والا اگر خدا نہیں تو بنیاد مذہب ضرور ہیں اور ایسے ایسے اخلاق سوز و انسانیت کش احکام صادر کرنا مذہب سے تو ضرور ہی وابستہ ہے۔ ترکی اور اصلاحات میرا مضمون نہیں ہے اور نہ کسی ہندوستانی کو اس کی فکر لازمی ہے کہ ترکی میں کیا ہوا ہے یا ہوگا ع

تجگو پرانی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

نیاز کارشن کیا ہے؟ واقعی اس کی تصریح نہ ہوئی۔ میری آنکھیں یہ الفاظ دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں کہ نیاز کارشن مذہب کو فنا کرنا ہے اس کی بیخ و بن اکھیرٹا ہے

مذہب کے لوازمات متعلقہ مثلاً خدا۔ روح۔ الہام۔ وحی۔ معجزہ۔ دوزخ۔ بہشت وغیرہم سب کی سترائے تکذیب کرنا اور ان کو محض فرب باطل قرار دینا اور ثابت کرنا ہے۔ صحیح اخلاق اور انسانیت کی ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہے

ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ عیسائی۔ بدھ۔ یہودی اور زردشتی کی تفریق کو یکسر مٹا ڈالنا اور ان سب کو انسان بنادینا ہے بس ”انسان“ نہ اس سے کم نہ بیش

تمام انسانوں کو بلا تخصیص و بلا امتیاز رنگ و روغن ایک ایسے جھنڈے تلے لاکر کھڑا کرنا ہے جس پر جلی حرفت سے لکھا ہو

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ہمہ نخل را شلخ و برگ و براند

مگر افسوس آنکھیں ترستی ہی رہیں اور یہ الفاظ ڈھونڈے سے نہ پائے گئے۔ ”مذہب“ کی گمراہ کن اصطلاح کی آڑ میں نیاز نے اپنا مشن کچھ کچھ دبی دبی زبان سے پیش کیا ہے مگر مولینا! جن لوگوں کو سقراط - نیپولین - ہیتھی بال - سکندر اعظم - اور لیٹن کی صف میں کھڑا ہونا ہوتا ہے وہ یوں اصطلاحی آڑوں میں نہیں اُجھے رہا کرتے۔ وہ اپنا پیغام برملا کہتے ہیں اور شخصی لیاقت و ذہانت ان کے پروگرام کی تکمیل کی ذمہ دار ہوا کرتی ہے۔ آپ اپنے مشن کا پروگرام ایک ہاتھ میں اور سرپرہمت مردانہ دوسرے ہاتھ پر لے کر ذرا شان جانا بازی سے میدان میں تو تشریف لائے بیچ جانے مادر ہند کے بے شمار سپوت اس پیغام حق پر لبیک کہنے کو سرفروشانہ بڑ ہیں گے کیونکہ اکثر ہیں جو اس مذہبی تعصب کی قبائے تنگ سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور مع ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریباؤں پر

(نگار) فاضل مراسلہ نگار نے چند باتیں لکھی ہیں

ایک یہ کہ مذہب کا مفہوم ہمیشہ سے یہی چلا آیا ہے کہ صرف خدا کی پرستش کی جائے اور اس سے متجاوز ہونا ”فلسفہ و اخلاق“ کے حد و د میں آجانا ہے جو مذہب سے بالکل علیحدہ چیز ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک مذہبی انسان واقعی کسی مذہب کا حامل کہلائے اور ”فلسفہ و اخلاق“ کا پابند نہ ہو،

دوسرے یہ کہ مذہب اسلام کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا غلط ہے، اس کے احکام اور واقعات تاریخی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے مذہب کے لئے لوگوں کو قتل تک کر ڈالا ہے چہ جائیکہ معمولی جبر و اکراہ

تیسرے یہ کہ سوائے ”الحاد و لامذہبیت“ کے بہ حالات موجودہ کوئی دوسری صورت احساس انسانیت پیدا کرنے کی نہیں ہے جو تھے یہ کہ عورتوں کی ترقی و آزادی ان کا فطری حق ہے اور اس کی مخالفت نازیبا ہے۔ اور پانچویں یہ کہ مجھے پوری ہمت مردانہ کے ساتھ اپنا مشن لے کر نکل آنا چاہئے کیونکہ مادر ہند کے بے شمار سپوت اس پیغام حق پر لبیک کہنے کے لئے سرفروشانہ بڑھے ہوئے نظر آئیں گے

اب میں مختصراً اپنے خیالات پیش کرتا ہوں :-

(۱) یہ بالکل درست ہے کہ مذہب سے پرستش خدا کے خیال کو متنگ نہیں کر سکتے، لیکن اس پرستش کی غایت سے ہستی اخلاق کو علیحدہ کر دینا یقیناً اس فساد و مقصود کی مخالفت کرنا ہے۔ جو فی الحقیقت مذہب کا ہونا چاہئے

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ دنیا میں سب سے پہلے مذہب کا خیال پیدا ہوا یا درستی اخلاق کا تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ مذہب نے یادہ مقدم الحمد ہے، کیونکہ حوادثِ طبیعی کے رموز نہ سمجھ سکے جو کیفیت خوف و ہراس کی انسان پر طاری ہوئی اسی نے سب سے پہلے ”خدا“ کا خیال انسان کے دل میں پیدا کیا اور اسی نے پرستش یا عبادت کی بنیاد دنیا میں ڈالی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مناسبت رکھتا

کہ جب رفتہ رفتہ انسانی دماغ زیادہ ترقی یافتہ ہوا اور سماجی زندگی کے اصول مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو سرداران قوم نے اسی قدیم مذہبی خیال کی زمین پر تحفظ قومی کے اصول کی داغ بیل ڈالی، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ مادی اثرات و نتائج کی طرف جلد متوجہ ہو جاتا ہے اور اُس وقت کا مذہب بھی مادی خدا کی پرستش کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

جب یہ ابتدائی دور بھی ختم ہو گیا تو فکر و قہقہہ کا وہ دور شروع ہوا جس نے مذاہب کو زیادہ ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا اور ہر چند مقصود وہی تحفظ قومی تھا، لیکن خدا کے مفہوم میں مادیت کا عنصر کم کر دیا گیا۔ اور مذہب میں ایک ہلکی سی جھلک فلسفہ کی پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام ہوا۔ اور خدا کا تصور اتنا صاف اور ستھرا ہو گیا کہ اس میں قبول فلسفہ کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور وقت آیا کہ سماج کا مفہوم ایک محدود قوم و ملک سے منجاوڑ ہو کر نوع انسانی تک وسیع ہو، لیکن قبل اس کے کہ اس وسیع خیال کی عملی تکمیل ہوتی، بانی اسلام کی ساری عمر ابتدائی دشواریوں کے دور کرنے میں صرف ہو گئی اور اسلام کی یہ اہمیت بردے کا رہ آسکی

یہ بالکل صحیح ہے کہ بانی اسلام نے جنگ کی، کفار کو قتل کیا، لیکن ان بلیتوں کا تعلق مذہب کی اُس صحیح تعلیم سے نہ تھا جو ”لا اکفرک فی الدین“ میں پنہاں تھی، بلکہ تحفظ قومی کے اُس خیال سے وابستہ تھا جس کا استوار ہو جانا اصل مقصد کی تکمیل سے قبل ضروری تھا، اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بانی اسلام کے زمانہ میں جتنی جنگیں ہوئیں وہ سب دفاعی تھیں اور جارحانہ۔ ہر چند یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر موافق و مخالفت دونوں گفتگو میں ہو سکتی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی وہ تعلیم جس کا تعلق محض درستی اخلاق سے ہے وہ تمام نوع انسانی پر عادی ہے اور اس کا مقصد سوسائٹی کا ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جو تہذیب مذہب و ملت کو متاثر و خوب عامر کے مرکز پر سب کو یکجا کر دے۔ اس لئے اب سوال یہ نہیں ہے کہ اسلام نے کیا کیا بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ میرے سامنے بالکل یہی حقیقت ہے اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر میں اسلام کا وہ مفہوم پیش کرتا ہوں جو ”لا مذہبیت“ تک منجر ہو سکتا ہے

میرے نزدیک اسلام نام ہے اُن اصول کے مجموعہ کا جو بہترین تہذیب اور انسانی دماغی و ذہنی ترقی کے حصول کے لئے ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور اس کے لئے نہ ہم کو اسلام کی گزشتہ تاریخ سے استشہاد کی ضرورت ہے نہ اُس وقت کے اصول معاشرت سے

الغرض جو چیز آپ کے سامنے ہے، وہی میرے سامنے بھی ہے، فرق یہ ہے کہ آپ مذہب کے خیال ہی کو لے کر قرار دے کر تمام مذاہب کو بُرا کہتے ہیں اور میں تمام مذاہب کے مقاصد کو صحیح و درست سمجھ کر اُن سب کو متحد کرنا چاہتا ہوں اس بات پر کہ اصل مذہب نام ہے تفریق مذاہب کے منادینہ کا اور اسلام کا مفہوم یہی ہے

(۲) عورتوں کے باب میں آپ نے میرے جس نوٹ کا ذکر کیا ہے وہ لاہور کے ایک جلسہ خواتین کے متعلق تھا اور مرآت فرمائے اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے کبھی عورت کو مرد سے فرد تر نہیں سمجھا، میں نے کبھی یہ

نہیں کہا کہ وہ ترقی نہ کرے اور مردوں کی غلام بنی رہے، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ سوسائٹی میں مرد و عورت دونوں کے فرائض علیحدہ علیحدہ ہیں اور ملی یا ذہنی ترقی کے یہ معنی نہیں کہ مرد و عورت کے فرائض انجام دینے لگے اور عورت مرد کے

اس وقت سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سب سے زیادہ حقوق طلب اور سب سے زیادہ مدعی مساوات، مغرب کی عورت ہے، جس کی پیروی ہندوستان کی عورتیں بھی کرنا چاہتی ہیں، لیکن عورت کی موجودہ رفتار ترقی نے مغرب کی سوسائٹی کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

اس لئے میں یہاں کی عورت کو ترقی یافتہ حالت میں تو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کو پسند نہیں کرتا کہ وہ مرد بننے کی کوشش کرے، جبکہ عورت، عورت ہونے ہی کے لحاظ سے زیادہ قابل احترام چیز ہے۔ اور سوسائٹی کا توازن بھی اسی طرح قائم رہ سکتا ہے (۳) تیسری بات جو آپ نے میری ہمت مردانہ کے متعلق لکھی ہے سو اس کا جواب کیا دوں۔ کیونکہ اس کا تعلق بہت کچھ میری ذاتیات اور ذاتی حالات سے ہے۔ میرا مشرب کام کرنا اور کام کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھنا ہے، ہلاک ہو کر اس کو ختم کرنا نہیں۔ شہید ہونا مجھے پسند نہیں، غازی رہنا چاہتا ہوں اور جنگ کے تمام اُن اصول کو سامنے رکھ کر جہاں مصلحت کے سوا کسی اور کی حکومت نہیں

تین شباب افرا اور صحت بخش دوائیں

عنبریں	ہضمین	حاذق پلز
مقوی اعضا دلیہ اور بے نظیر مفرح معجون ہر اسکے استعمال کے بعد خواہ کتنا ہی دماغی کام کیجئے بالکل تکان نہیں ہوتا، جسمانی و دماغی تکان دور کر کے فوراً فرحت پیدا کرتی ہے۔ رقت و سرعت اور ضعف باہ کا یقینی شفا بخش علاج ہے۔ دماغ، دل اور اعصاب کے طاقت دہتی ہے	معدے کو کمر و رکے بغیر بھوک بڑھاتی اور غذا ہضم کرتی ہے۔ احتباس ریح، قراقر، بد ہضمی اور بادی ہوا سیر کی شافی دوا ہے۔ مقوی معدہ ہاضم، ملین اور خوش ذائقہ ہے	جریان و احتلام، رقت و سرعت، دماغی قبض، اعضا شکنی اور ضعف باہ کو دور کرنے اور قوت بڑھانے کے واسطے اس سے ارزاں اور زود اثر دوا نہیں مل سکتی ہے قبض کشا اور مقوی معدہ و جگر ہیں۔ مفر اور نشیطہ اجزاء سے پاک ہیں۔ قیمت ۱۳۰ گولیاں ایک روپیہ دوا

عالی جناب سید وحید صاحب اذیر علی گڑھ میگزین کی رائے:- مجھے 'عنبریں' اور 'ہضمین' بہت پسند ہیں۔ دماغی قوت کے لئے ایسی اچھی چیز بہت کم جگہ ملے گی۔ عالیجناب مولوی سید مہدی حسن صاحب دکیل بہار شریف کا ارشاد:- میں نے حاذق پلز، ہضمین اور عنبریں استعمال کیں۔ زود اثر اور قائمہ بخش ثابت ہوئیں۔ عالیجناب حکیم سید حسن علی الدین صاحب کیم سنگار بڈی حیدر آباد کن فرماتے ہیں:- عنبریں بہترین مقوی دوا ہے بڑی بات یہ ہے کہ زود اثر ہے ایک کار و دیکھ کر آج ہی "انسکھ اکسیر دماغ" مفت منگائیں۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہترین تحفہ ہے

پتہ:- عنبریں فارمیسی ۹ جلال آباد (مظفرنگر) یو۔ پی

مطبوعات موصولہ

پندرہس کی باتیں | سفرنامہ میں جناب مرزا حسین احمد بیگ ناظم عدالت، حیدرآباد کا جو ممالک اسلامیہ اور یورپ کے دوران سیاحت میں مرتبہ کیا گیا ہے

ادب میں تاریخ و سفرنامہ کو تقریباً ایک ہی مرتبہ حاصل ہے، لیکن چونکہ سفرنامہ میں صرف ذاتی تجربات ایک خاص اسلوب سے بیان کئے جاتے ہیں اس لئے اس میں نسبتاً زیادہ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اسے زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں علی الخصوص اس وقت جب سیاح نے اسے شگفتگی کے عالم میں مرتب بھی کیا ہو

مرزا صاحب کا یہ سفرنامہ میرے نزدیک اسی تحت میں آتا ہے اور مفید ہونے کے ساتھ ساتھ کافی لچسپ بھی ہے۔ تصاویر وغیرہ بھی جا بجا نظر آتی ہیں اور طباعت و کتابت بھی بنایت پسندیدہ ہے۔

گاندھی نامہ | مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے بہ اختلاف جلد تین روپیہ اور غیر میں مل سکتا ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مہاتما گاندھی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے لیکن نظم میں۔ اس کے مصنف میاں محمد رفیق ام۔ اسے اُن لوگوں میں سے ہیں جو ملک و قوم کے ذرات کا سچا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس تصنیف کو جو درجہ عقیدت و ارادت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس میں مہاتما گاندھی کے بعض اہم سوانح حیات کو سامنے رکھ کر فاضل مصنف نے ایسے ایسے پہلو درس بصیرانہ کے پیش کئے ہیں کہ ایک شخص داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ مصنف ایسی خشک باتوں کو کیونکر ایسی پاکیزہ نظموں میں منتقل کر سکے۔ نظمیں مختلف بحر و مائیں ہیں اور طرز ادا کے تنوع نے ان میں بہت دلکشی پیدا کر دی ہے۔
راون کی رُوح کا گیت ملاحظہ ہو:-

محفل کائنات میں

انجمن حیات میں

عالم ممکنات میں

میرے نفس سے جوش ہے

میرے خراس سے تیش

ولولہ و خروش ہو

شعلہ بھیرار سے

دہر کی ہر جمیل شے مجھ سے نمونہ زیر ہے بن کی اجدھیا پری مجھ سے خراج گیر ہے
مجھ سے نجوم تابدار تابش مستعار لیں پھول جمال و حسن کا خرقة از رنگار لیں

شاخ نہال گلفشاں مجھ سے بہار در بہار
حسن فروغ در فروغ عشق شرار در شرار

خونِ رگِ حیات ہوں

میں ہوں گر تو کچھ نہ ہو

زنگس خوابناک کو حزدہ تم مری صدا غنچہ رننا شگفتہ کو موج نسیم جانفزا

مجھ میں جہانِ زیست میں بطورِ مثل جان تو ہمراہ تار و بود کار شاہد حق کا پیر ہن

سوز درونِ خاک اگر ایک شرر بھی کم ہوا

پھر مے دل کی خاک سے اگلے تازہ دم ہوا

برقِ دل ممت ہوں

میں ہوں گر تو کچھ نہ ہو

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نظم و شعر کے لحاظ سے اس مجموعہ کا کیا مرتبہ ہے۔ تقریباً ۲۰۰ صفحات کا یہ بیش بہا رسالہ
پھر میں فاضل مصنف سے باغباں پورہ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے

انجمن روح | جناب اختر انصاری بی۔ اے بدایونی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب اختر انصاری کے کلام سے
ہمارے ناظرین نا آشنا نہیں۔ ان کے قطعات گاہے گاہے نگار میں شائع ہوتے رہتے ہیں

جناب اختر ملک کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن کی موجودہ فکر سے اُن کے درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ پاکیزہ
خیال کے ساتھ پاکیزہ زبان استعمال کرتا۔ یہ ہے خاص معیار نظم کی خوبی کا اور ہمیں یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ جناب اختر
کے کلام میں دونوں کی کمی نہیں

اس مجموعہ میں قطعات بھی ہیں اور منظومات بھی، غزلیں بھی ہیں اور متفرق اشعار بھی، لیکن ایک ذہنِ خلاق اور فکر
صحیح کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں۔ چونکہ اختر فطرتاً حسن پرست واقع ہوئے ہیں اس لئے آرٹ کی پسندیدگی کے ساتھ ساتھ جو
جذباتِ قلب انسانی میں پیدا ہوئے ہیں وہ بہ کثرت ان کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار سے اُنکے
رنگِ تغزل کا پتہ چل سکتا ہے :-

(کون ہے بے قرار میرے لئے آج کچھ بیقرار سا ہوں میں)

ہائے مدہوش رات کا افسوس میں زمیں پر ہوں رنج تاروں میں

وہ راز کہ اغیار سے کہ بھی نہیں سکتے سینے میں بھی اللہ چھپا یا نہیں جاتا

غم کے جرمات ملتے ہیں جوں جوں عیش کی پیاس بڑھتی جاتی ہے

مٹ گئے وہ نظار ہائے جمیل لیکن آنکھوں میں عکس چھوڑ گئے

ہر چند جناب اختر کا موجودہ رنگ کوئی مستقل رنگ نہیں کہلایا جاسکتا اور یقیناً مطالعہ و تجربات کے بعد اس میں کچھ نہ کچھ تغیر ہونا ہے، لیکن ہمیں ان کی فطرت سے توقع ہے کہ یہ تغیر بالکل پسپا نہ ہوگا۔ ابتدا میں دو صفحات کا ایک مختصر سا دیباچہ بھی بہ اتباع آسکر وائلڈ درج کیا گیا ہے۔ جس میں آرٹ پر آسکر وائلڈ ہی کے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی قیمت عہ رہے اور مولوی محمد افضل خاں صاحب سے محلہ ناہر خاں بدایوں کے پتہ پر مل سکتی ہے

یہ دونوں رسالے مجموعہ ہیں جناب فہمی ترمذی کی ادبی و اخلاقی، قومی و وطنی نظموں اور غزلوں کے۔ جناب فہمی گو ادبی دنیا میں وسیع شہرت نہ رکھتے ہوں، لیکن اُس مخصوص حلقہ میں جہاں وہ زندگی بسر کرتے ہیں یا ان لوگوں میں جنہوں نے ان کے کلام کا بامعانہ نظر مطالعہ کیا ہو بہت عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ مجھے خود جناب فہمی سے ملنے اور ان کا کلام سننے کا بابا اتفاق ہوا ہے، اس لئے اگر میں اُن کا اور اُن کے کلام کا معترف ہوں تو اس کو میرا شاعرانہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ فہمی جن صفات کا انسان ہے وہ واقعتاً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں اور جو پاکیزہ قوت فکر انھیں نصیب ہوئی ہے، وہ کم لوگوں کو میرا آتی ہے

فہمی نے "ولولہ و جوشش" کی شاعری نہیں کرتے، بلکہ غور و تامل، فکر و تدبر کو پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی اخلاق کا بلند پہلو ہمیشہ اُن کے سامنے رہتا ہے اسی لئے ان کے کلام میں ابتذال کا کہیں پتہ نہیں۔ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ فنی غلطیاں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ فہمی اپنی فطرت کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ سر زمین بھوپال سے باہر ان کا نشو و نما ہوتا اور قدرت کی اس پاکیزہ ودیعت سے بہتر کام لینے کے لئے انھیں زیادہ بلند سوسائٹی نصیب ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ معیشت و معاشرت کی مجبوری نے انھیں بھوپال سے باہر قدم نہ نکالنے دیا اور اس طرح ان کا مستقبل تباہ

ہو کر رہ گیا

یہ دونوں مجموعے علی الترتیب عدد ۶ اور ۷ میں جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتے ہیں

نقش آخر

ڈرامہ ہے جناب اشتیاق حسین قریشی کا جسے جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ جناب اشتیاق کے متعدد ڈرامے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں اور نگار میں ان پر یو یو بھی ہو چکا ہے۔ میں اشتیاق صاحب کی ڈرامہ نگاری کا معروف ہوں اور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں کی طرح اس کو اختیار کریں

”نقش آخر“ ان کا تازہ ترین ڈراما ہے جس میں تعلیم جدید کے نقائص کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر چند میں نے اسے بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن چونکہ اس سے قبل ان کے بعض ڈراموں کو دیکھ چکا ہوں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس متعلق بھی وہی رائے نہ قائم کروں جو دوسرے ڈراموں کے متعلق قائم کر چکا ہوں۔ اس کی قیمت ۱۰ روپے

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں حصہ دوم

جناب محوی لکھنوی نے ان کہانیوں کو مرتب کیا ہے اور اس میں خاک نہیں کہ ان کا مطالعہ بچوں کے لئے فائدہ سے خالی نہیں گویا ان کے لحاظ سے اس میں ہنوز ترقی و اصلاح کی گنجائش باقی ہے اور صحت تاریخی کے لحاظ سے بھی حذف و اضافہ ہونا چاہئے، تاہم ناشر و جامع کی نیت و خدمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ دہلی سے امر میں مل سکتی ہے

بچوں کی نظمیں

جناب سعید انصاری نے مختلف شعراء کی منظومات اس نام سے مرتب کی ہیں۔ اور انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ بچے متاثر ہوں۔ شاعری کے لحاظ سے بعض نظمیں یقیناً قابل انتخاب نہ تھیں، لیکن فاضل جامع نے شاید اس کا لحاظ نہیں کیا اور صرف موضوع کی شگفتگی کو کافی سمجھا

نفسیات مذہب

یہ مختصر سا مقالہ ہے جو سید و ہاج الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے جامعہ ملیہ دہلی کے جلسہ اردو اکادمی میں پڑھا تھا اور اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے وہ لائق صد ہزار تحسین ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس بحث میں مطلقاً تنگ نظری سے کام نہیں لیا اور ”حلسہ مذہبی“ کی ضرورت کو جس انداز سے ثابت کیا ہے۔ وہ دوسروں کے ”حلسہ مذہبی“ کا بھی احترام پیدا کرنے والا ہے

ہر چند مجھے اصولاً اکثر مباحث سے اختلاف ہے، لیکن پھر بھی میں فاضل مصنف کی کاوش و جستجو کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس تصنیف کی اس کی زبان ہے۔ جس نے ایسے خشک علمی مسئلہ کو ادب و شعرا کی طرح دلچسپ بنا کر پیش کیا۔ اس کی قیمت ۸ روپے رکھی گئی ہے

جمال الدین افغانی

یہ مقالہ بھی جامعہ ملیہ کے اردو اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب اس کے مرتب ہیں اور مکتبہ جامعہ ملیہ ناشر۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت ۸/

فروع اردو

اسلامیہ کالج لاہور میں ایک بزم ”فروع اردو“ کے نام سے سلسلہ ۶ سے قائم ہوئی ہے جس کے جلسوں میں پروفیسر اور طلبہ اپنے اپنے مقالے پڑھتے ہیں۔ انہیں مقالات کا مجموعہ اب اس نام سے

شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں گیارہ مضامین ہیں جن کی فہرست یہ ہے :-

اقبال اور وطنیت — اردو شاعری میں ہجو — رنجی — اردو میں سیاسی شاعری — حسرت موہانی
غالب کی قنوطیت — اردو شاعری میں حفیظ کا پایہ — غالب کی رجائیت — سائنس کے جدید نظریے
تجزیہ نفسی — خود تاثری — اس فہرست کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادبی مقالات کے ساتھ
ساتھ علمی مضامین بھی بزم میں پڑھے گئے ہیں اور میرے نزدیک اردو کی صحیح خدمت یہی ہے
مقالات اچھے ہیں اور ان کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ مجموعہ سکرٹری بزم فروع اردو اسلامیہ کالج لاہور سے
دستیاب ہو سکتا ہے۔ قیمت عیار زیادہ نہیں ہے

افسانہ کے عشق

سات افسانوں کا مجموعہ ہے جنہیں حامد علی خاں صاحب بی۔ اے جاسٹ اڈیٹر

ہمایوں نے دوسری زبانوں سے منتقل کیا ہے۔ ان سات افسانوں میں سے تین ٹگور سے لئے
گئے ہیں، دو نائے سنتا دیوی اور سینتا دیوی کے ہیں اور ایک زونا گیل کا
ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اصل زبان کا زور بیان باقی رہے اور ترجمہ بھی نہ معلوم ہو۔ اور اس باب میں حامد علی خاں صاحب
کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آ سکتی ہے
کتاب نہایت خوبصورت سائز میں شائع ہوئی ہے اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ جا بجا
تصاویر کے اضافہ نے اور حسن پیدا کر دیا ہے

یہ مجموعہ عمر میں دفتر ہمایوں لاہور سے مل سکتا ہے

لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے

حجاب اسماعیل کے چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جسے دارالاشاعت

پنجاب لاہور نے بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شائع

کیا ہے

حجاب اسماعیل ہندوستان کی مشہور اہل قلم خواتین میں سے ہیں اور ملک کے مختلف رسائل میں ان کے افسانے
شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زبان و تخیل دونوں حیثیت سے وہ کامیاب فسانہ نگار ہیں اور اتنی کامیاب کہ اس وقت کے دلوں
میں بھی صرف چند اس مرتبہ کے ملیں گے۔ یہ مجموعہ عہر میں مل سکتا ہے

میری نامتوم محبت اور دوسری رومان | یہ بھی حجاب اسماعیل کے چار محبت بھرے افسانوں کا مجموعہ ہے اور خوب ہے - قیمت ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ وہی دارالاشاعت پنجاب لاہور

نو اور | لطائف و ظرائف کا مجموعہ ہے جسے ہمارے ٹھکانے کے مشہور اہل قلم مرزا محمد عسکری بی۔ اے نے مرتب و شائع کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں متعدد کتابیں پائی جاتی ہیں، لیکن جو ترتیب مرزا عسکری صاحب کے پیش نظر تھی وہ غالباً کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ اس میں موضوع کے لحاظ سے بھی تقسیم کردی گئی ہے اور طبقہ کے لحاظ سے بھی

کتاب بہت دلچسپ ہے اور ایک روپیہ میں مولف سے حکیم عبدالعزیز روڈ ٹھکانے کے پتہ پر مل سکتی ہے

سرگزشت اسیر | فرانس کے ادیب شہیر وکٹر ہیوگیو نے ایک فسانہ لکھا تھا جس کا نام *The last days of condemned*

ہے۔ اس فسانہ سے اس کا مدعا سزائے موت کی تین گھنٹوں کا ٹھکانے والا تھا وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اور موضوع جتنا اہم ہے وہ بھی محتاج بیان نہیں اس لئے ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جاتا۔ اور ملک کو اردو بیک اسٹال لاہور کا نمونہ ہونا چاہیے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کیا اس کا ترجمہ کسی صاحب مسر سعادت حسن صاحب نے کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت صاف و سلیس ہے قیمت ۵۰ روپے طبع و کتابت کی خوبی کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

صدائے مشرق | جناب فائق کرپوری کے نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ نظموں کا رنگ زیادہ تر اصلاحی ہے۔ قیمت ۴۰ روپے اور ملنے کا پتہ رام سوامی کواریٹر کراچی

حسن کار | مختصر مجموعہ ہے چند ادبی تنقیدی مقالات کا جو محمد صادق صاحب ضیا کے فکر و باغ کا نتیجہ ہیں جناب ضیا ابھی طالب علم ہیں لیکن مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی طرف سے بہت ذہین دماغ لے کر آئے ہیں۔ اگر ان کی یہ مشق جاری رہی تو ہم کو اس سے بہتر نتائج فکر کی توقع رکھنا چاہئے۔ یہ مجموعہ ۸ روپے میں قصر الادب اگرہ سے مل سکتا ہے

دو آتش | لالہ دیوان چند گڈھوگ نے فارسی، اردو اور بھاشا کے متعدد ہم مضمون اشعار اور دوہے اس رسالہ میں یکجا کر دیے ہیں اور کافی کاوش سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہے۔

دیوان چند صاحب ایٹ آباد میں نقشہ نویس پکری ہیں اور انھیں سے ۸ روپے میں یہ کتاب مل سکتی ہے
مسلمانان موریشس کی تعلیمی و معاشرتی حالت پر تبصرہ | لوئس مارشس کی مسلم ایجوکیشن

سوسائٹی نے یہ رسالہ شائع کیا ہے تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کے حالات سے آگاہی حاصل ہو اور باہم برادرانہ تعلقات قائم ہو سکیں۔ ضرورت ہے کہ یہاں کے مسلمان اس کا مطالعہ کریں۔

جاذب دہلوی بی۔ اے کی ایک نظم ہے جو جی بی سائز کے ۲۴ صفحات کو محیط ہے۔ نظم کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسانی مصائب کی ذمہ دار موجودہ تہذیب ہے۔ ۱۰ قیمت ہے اور کتب خانہ علم و ادب دہلی سے مل سکتی ہے

لاہور میں ایک ادارہ ”اصلاح نوجوانان“ کے نام سے قائم ہے، جس کا مقصود نوجوانوں میں صحیح مذہبیت پیدا کرنا ہے۔ اس گلدستہ میں اسی مقصد کے لئے وہ مختلف مضامین و مقالات جمع کر دیے گئے جو اس ادارہ کے ذریعہ سے شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ ۸۰۰ میں ادارہ مذکور سے مل سکتا ہے

امامیہ شن کا چودھواں تبلیغی رسالہ ہے جسے مولانا سید آغا مہدی صاحب نے تصنیف کیا

علی اور کعبہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کتب اہل سنت سے جناب علی کی ولادت کعبہ کے اندر ثابت کی جائے۔ ایک آنے میں دفتر امامیہ شن حسین آباد۔ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

جناب دیوان امر ناتھ صاحب حسن امرتسری کے دوسرے ہیں جن میں ان دونوں طبقوں کی معاشرتی و اخلاقی زندگی کا فرق ظاہر کیا گیا

غریبوں کی دنیا۔ امیروں کی دنیا

ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو کچھ لکھا ہے وہ یکسر واقعہ و حقیقت ہے۔ زبان سادہ، الفاظ مؤثر، نیت مخلصانہ اور نتیجہ اخلاق آموز۔ اس رنگ کے مسدس میں اور کیا چاہئے۔ جس حد تک شاعری کا تعلق ہے اس کا اندازہ ذیل کے دو بندوں سے ہو سکتا ہے:-

وہی فصل گل کی زراں دُریاں ہیں وہی جانِ بابل کی دل سوزیاں ہیں
 صبا کی وہی راحت افر دُریاں ہیں وہی ابر کی عشرت آموزیاں ہیں
 غرض دستِ قدرت کے شکار سارے
 غریبوں کی دنیا کے ہیں بار سارے
 نہ پوچھو یہ کیا ہے کہ میروں کی دُنیا ہو او ہوس کے اسیروں کی دُنیا
 یہ ہے زہر آلودہ تیروں کی دُنیا ہے القمہ یہ سخت گیروں کی دُنیا
 مروت جسے کہتا ہے کل زمانہ
 یہاں پائمال اس کا ہے آستانہ

یہ دونوں مسدس غالباً مفت ملتے ہیں

پردیسی کی فریاد

اے موج صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں کی خاک بھی ہوا آنکھوں سے لگانے کے قابل وہ دیس جہاں کا ہر ذرہ ہے ایک عبادت خانہ دل

وہ میرے خیالوں کی جنت، وہ میری امیدوں کا حاصل وہ میری مرادوں کا مرکز، وہ میرے ارادوں کی منزل

اے موج صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں طفلی کی بہاریں دشمن درقصاں گزری ہیں وہ دیس جہاں غم کی گھڑیاں صدرنگ بے ماں گزری ہیں

وہ دیس جہاں میری راتیں سرشار و غزلخواں گزری ہیں وہ دیس جہاں میری صبحیں مسرور و درخشاں گزری ہیں

اے موج صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں ندی کے کنارے نہروں کھیلا کرتا تھا کس شوق سے پانی کی لہروں کے رقص کو دیکھا کرتا تھا

مہتاب سُلانے آتا تھا، خورشید جگایا کرتا تھا ہستی کے ستم سے ناواقف، جینے کی تمت کرتا تھا

اے موج صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس فضاؤں میں جس کی سرشار جوانی آئی تھی وہ دیس جہاں دل میں اُلفت کی پہلی کرن تھرائی تھی

وہ دیس جہاں اک شوخ نظر پیغامِ جراحت لائی تھی رگ رگ میں نہاں اک درد سا تھا، اک چوٹ سی پرکھائی تھی

اے موج صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں بیکار تھیں سب بستی کی ستم پر درگھاتیں دچپ وہ باغوں کی سیریں، دلکش وہ سہانی برساتیں
گھنگھور گھٹاؤں کا اٹھنا، ساغر کی کھنک، سرخوش باتیں اللہ کہ صہر پنہاں ہیں وہ دن، اللہ کہاں ہیں وہ راتیں
اے موج صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

ہاں کچھ تو سنا اے روحوں کو پیغام طرب دینے والی مانا کہ فضا ئے گیتی میں ہے کھیل دلوں کی بامالی
مانا کہ دمانہ ہے یکسر انوارِ محبت سے خالی مانا کہ نہیں دنیا میں گراں یاروں پر کسی کی بے حالی
اے موج صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

بے بدلتا! مجھ بیکس کو یارانِ وطن کیا بھول گئے پردیس کا عالم ہوتا ہے کس درجہ غم افزا بھول گئے
مدت سے ہے اک آوارہ وطن محروم تنہا بھول گئے آتا ہوں کسی کو یاد بھی میں سب تجھ کو وہاں یا بھول گئے
اے موج صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

کہنا کہ تمہارے ساتھی گو دنیا کے ستم نے لوٹ لیا پردیس میں پیہم ناکامی کے رنج و الم نے لوٹ لیا
ہستی کی متاعِ عشرت کو بے مہرئی غم نے لوٹ لیا اُمید کو نا اُمیدی کے احساسِ اتم نے لوٹ لیا
اے موج صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

گھنگھور گھٹائیں آتی ہیں، وہ منہ اشکوں سے دھوتا ہے غنچے متبسم ہوتے ہیں، وہ سر دھنتا جاں کھوتا ہے
تم مجھ فغاں پاؤ گے اُسے، جب ذرہ ذرہ سوتا ہے روتوں کو ہنسنا تا تھا جو کبھی، دن رات پڑا اب روتا ہے
اے موج صبا کچھ حال سنا اس دیس کے رہنے والوں کا

علی اختر (حیدر آباد دکن)

اعتبار

تجھے پاس عشق نہیں نہیں

مگر آہ مجھ کو بستی نہیں

تری ہر نگاہ غور سے

کشیش نمودِ غور ہے

تری ہر نمائشِ تکنت

کبیں عرش ہے کہیں طوطا ہے

ہیں گواہ تیری خموشیاں

کہ تو سنگدل بھی ضرور ہے

یہ سہی کہ میری ہر اک نظر

ترے التفات سے دور ہے

تو ہزار مجھ سے خفا سہی

تو ہزار مجھ سے جدا سہی

تو وعدے ذوقِ وفا سہی

مگر آہ مجھ کو یقین نہیں

تجھے ایک نغمہ بے اثر

ہے شکستِ بربطِ آرزو

ترے ابتسام سے شکوہ گر

خاشی جراثیمِ بے رُو

ترے لالہ زارِ نشاط میں

نہیں سوزِ مہر و وفا کی بو

یہ سہی کہ تیری نگاہ میں

نہیں آنسوؤں کی کچھ آہ

تجھے بیکسوں کی دعا سے ضد

تجھے التجائے وفا سے ضد

تجھے رسمِ مہر و دلا سے ضد؟

مگر آہ! مجھ کو یقین نہیں

روشِ صدیقی

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

ناول ڈرامے اور افسانے

تاریخ و سوانح حیات

لغات و ادب

گوڈر کالال	فرانس مادری	قطرات اشک	مومنی	تاریخ مغرب	بازاری زبان
شوک آرابیلم حصہ دوم	افسانہ نادرجہاں	جنت در اناجہ	دوایع ظفر	تفہیم تاریخ اسلامی	لغات سعیدی
حصہ سوم	اقبال دوہن	بس کار و کم	باسین شام	حصہ ۲	لغات کشوری
سیدہ کے خطوط	حسن معاشرت	فسانہ سعید	طوفان اشک	حصہ ۳	تجربہ تحقیق مجلد
پیاری سہیلی	ایامی	خونناک گیتی	شاہین ووداج	حصہ ۴	مجموعہ لغات فارسی
نئی نویلی پیاری آسیلی	سولہ ہانیاں	سیلاب شگفتہ تصویر	درس عشق	اصالحات	مجموعہ لغات سوانی
عہدوں کی انشاء	سترو ہانیاں	بے زبان دوست	گردہ پی چہرہ	امت کی مائیں	جوہر اللغات
انشاء نسواں	سورہ قصے	جمال ہم نشین	جن بندوق باز	الزہرا	گوہر اللغات
سیرۃ الکبریٰ	مرآۃ العروس	تفسیر عصمت	مرخوہ قاہت	اسوۃ حسنہ	پیرایع سخن
طرز زندگی حصہ اول	نبأۃ النش	جوہر قدامت	انقلاب قسطنطنیہ	ہندو شعراء	دکنی لغت
محدثات تصویر	توجہ النصوح	نابینہ	شاہد رعنا	شونہار	جوہر لغات غیر
اندوایع البنی	کبیر فاطمہ	پراسرار قتل	ویدیا کی سرگزشت	سوانح اکبر الہ آبادی	عزیز اللغات
اندوایع الانبیا	ننگہ پریاں	اعلان آزادی	شکوہ محبت	سفر نامہ علوان	تذکرہ ریختی
سیرۃ عائشہ صدیقہ	نصیحت کار کرمپول	سرگزشت اجرہ	نسوانی زندگی	تاریخ افغانہ	تاریخ اردو قدیم
عنت المسلمات	برکات سلطانی	نیزہ زندگی	دلالتی تھی	اسلام اور غیر مسلم	دکن میں اردو
سبیل الجنان	ابن الوقت	قلب حزیں	شمع خاموش	سیرت مصطفیٰ	منتخب کلام ہندی
بچوں کی پرورش	چند منہ	عروس کربلا	شب زندگی کامل	تاریخ اسلام جلد ۵	پاجات عمر خیام
حرز طفلان	منتخب حکایات	شہید مغرب	مودودہ	تاریخ اسلام جلد ۶	منتخب کلام ہندی
تہذیب نسواں	تندرستی	ماہ عجم	چندر کلا	اخبار الاندلس جلد ۳	اردو کے ماہر لکھنے والے
بیوی کی تعلیم	حفظ صحت	منج کمال	گلستان خاتون	خلافت موصیٰ	تفہیم الاخلاط
بیوی کی تربیت	طیب نسواں	مراب مغرب	صبح زندگی	خلافت مولدین	ملیض اردو
تربیت اطفال	رہبر صحت	منازلہ ساہو کمال غام	شام زندگی	عرب ورامکا مستقبل	نور اللغات جلد ۴

دواوین فارسی

دواوین اردو

دیوان شمس تبریز	کلیات غالب	دیوان غنی کشمیری	کلیات ظفر	کلیات نظیر اکبر آبادی	صنمناہ عشق
کلیات عراقی	کلیات صائب	دیوان ہلالی	کلیات مومن	گلزار دلغ	فریاد داغ
دیوان حافظ	دیوان ناصر علی	امیر خودی درموز سے	دیوان ناسخ	دیوان رند	عام خیال باتصویر
دیوان بیدل	کلیات سعدی	زبور عجم	کلیات مبر	دیوان ذوق	دیوان شہبازی
دیوان عرفی	کلیات حزیں	پیام شرق	کلیات سودا	گلگدہ عزیز	کلیات اکبر آبادی
کلیات جامی	دیوان عنصری	قصائد عزیز مجلد	کلیات انشاء	مرآۃ انیب	نقد و دانش جلد ۱

تذکرہ و تاریخ	جاسوسی کو ناول	مراثی	ناول سجاد حسین	ناول سجاد حسین	ناول سجاد حسین
پنیر عظم	مشرک موز	مراثی دہر	احسن الذی	چور دی کا کلب	جنید بغدادی
شب معراج	محاصرہ پیرس	مراثی امیر کامل	حاجی بھلول	مٹی جھری	مخدرات
سراج منیر	شیخ علی	مراثی ضمیر	بیادی دنیا	پیرام کی گرفتاری	جیو بے حق
پنیر عالم	پیرام کی واپسی	مراثی مونس	کاپٹن	عزت مبین	عزت مبین
سوانح حضرت رسول	انقلاب فرانس	مراثی دلگیر	مٹی جھری	ادبی کتابیں	فانچ و مفتوح
سید المرسلین	بحری فزاق	عجائب غرائب	طرح دار بوندی	ایک شرمی	ایک شرمی
حیدر کرار	فطری جاسوس	عجائب غرائب	طوسی فانوس	ایک شرمی	ایک شرمی
سیرۃ الصدیق	ژکی حرم سرا	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
عمر ابن خطاب	جنگ طرابلس	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
ابوبکر صدیق	پیرام چور	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
امام اسلام	زبردست	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
انجیب	کچی کاراز	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
عمر بن عبدالعزیز	عبدالرحمن ناصر	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
دولت فاروقیہ	عروس مصر	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
کلی سوانح نیربناہم	سیلاب خون	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
تذکرہ اولیا	سیاحت زمین	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
تذکرہ اولیا ہند	سیاحت ہوا	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
مراۃ الکونین	ماذنین مراکش	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
قصص الانبیاء مکمل	سمندر کی سیر	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
سفرنامہ چین	امیر الشوہزم	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
تخیص نواہج	روح بلی	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
خانہ جنت	امین بک	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
نقارۃ الصوفیہ	حجاج بن یوسف	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
خوانین المورہ	یوسف پاشا	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
شاہر شوہاں	انقلاب عثمانی	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
شاہر ہند	پیرام کی رہائی	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
مخدرات مخمومہ	پیرام کی آزادی	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی
بیمات بنگال	پیرام کی سرگذشت	عجائب غرائب	عجائب غرائب	ایک شرمی	ایک شرمی

نگار یکا کتبہ

مکتبہ ابراہیم پور کتبہ